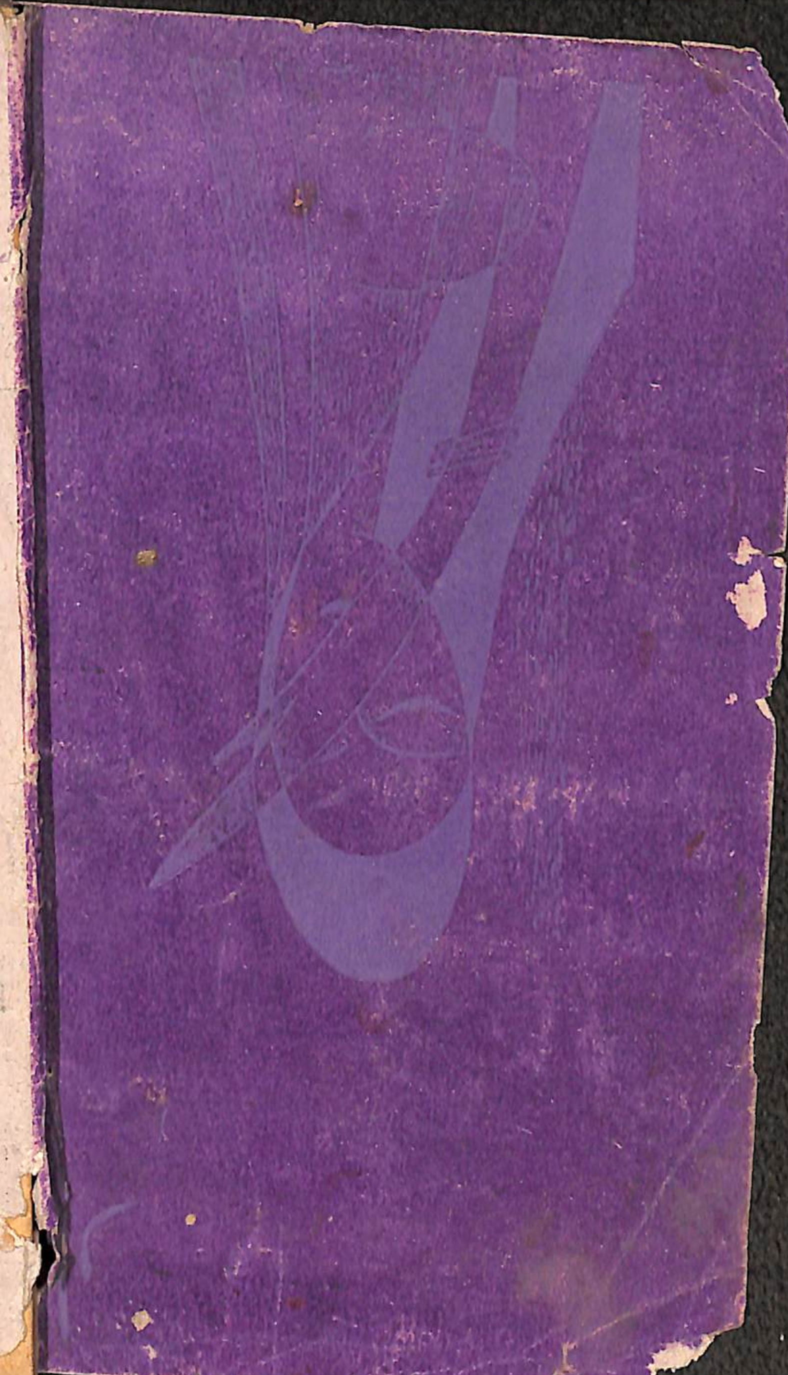


اردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار
ادبی ڈائجسٹ

جولائی سنہ ۱۹۷۳ء

مدیر
محمد ظہیر

قیمت سالانہ ۱۵ روپے — فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

دفتر شاہکار۔ مدنپورہ، وارانسی

فہرست

—

مضامین

غزلیں

طابع و ناشر ۔ محمد ظہیر ۔ مالکان شاہکار پبلیکیشنز ، وارانسی
مقام اشاعت ۔ مدنپورہ ، وارانسی
مطبع ۔ اکرام لیتھو الیکٹرک مشین پریس پہلاد گھاٹ وارانسی ۔

اپنی بات

بنارس جہاں ہمیشہ سے ہی علم و فن کا مرکز رہا ہے وہیں یہاں کے اردو داں طبقہ کی بے حسی بھی قابل ذکر رہی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ایسے ماحول میں رہ کر بھی شاہکار کو اپنے مقررہ وقت سے قارئین کو پہونچانے میں ادارہ کامیاب ہے اور شاہکار کو صحیح معنوں میں ادب اور فن کا شاہکار بنانے کی طرف ہم تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہم اپنے مستقل خریداران اور قارئین کے مشکور ہیں کہ انھوں نے شاہکار کو بنارس منتقل ہونے کے بعد اپنے تعاون کو برقرار رکھا۔ اور ہمیں فخر ہے کہ ہمارے معاونین میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

مرکزی فروغ اردو کمیٹی کے حالیہ فیصلے سے ہم مایوس نہیں ہیں کیونکہ اتر پردیش کے رہنمایان اردو کی سبک خرامی دیر آید درست آید کی ہی قائل رہی ہے۔

سید احتشام حسین نمبر نکالنے کے لئے ہم اہم اور دشوار کن مرحلوں سے گذرتے ہوئے اپنے کچھ دیرینہ قلمی معاونین اور سرپرستوں کے تعاون کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا تعاون حاصل ہوتے ہی ہم جلد از جلد احتشام حسین نمبر قارئین کی خدمت میں پیش کرنیکا اعلان کریں گے۔

جولائی کے شمارہ میں ملک کے کئی مشاہیر اہل قلم کی شرکت باعث مسرت ہے۔

(ادارہ)

رضیہ فصیح احمد

آگ اور پانی

"ہائے ہائے، کیسی چمک تھی خدا خیر کرے۔" حمائل نے سر پر دوپٹہ یوں اوڑھا جیسے آسمان کے بادلوں کو ڈھانپے دے رہی ہوں۔ "گرج ہونے سے پہلے ہی ساری لڑکیوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئیں۔ سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے جیسے بجلی پولیس کی طرح ان کا پیچھا کر رہی ہو اور کوئی دم میں انہیں آلینے والی ہو۔

"اللہ خیر۔" نانی کے خراب کانوں میں بھی بادلوں کی گرج پہنچ ہی گئی۔

"چلیے بھائی جان پتہ، ادھر دیکھیے باہر کی طرف دیکھیں گے تو اور وحشت ہو گی۔"

"بھئی پانچ بج رہے ہیں۔ خبریں لگاؤ۔" جنگ کے دنوں کی طرح بارش میں بھی خبریں فرض کی طرح اہم ہو گئی تھیں۔ ٹرانزسٹر بیچوں بیچ رکھ دیا گیا۔ اور سب خبریں سننے لگے۔ تاش کھیلنے والوں نے اتنی دیر کے لئے ہاتھ روک لیا۔

"قصر ایمن" کے الگ الگ حصوں میں رہنے والے سارے رشتہ دار اختلافات پس پشت ڈال کر اس وقت ملک پر وقت پڑنے والے باسیوں کی طرح متحد اور یکجا تھے۔ بے پناہ بارش کی وجہ سے کراچی کو "آفت زدہ" علاقہ قرار دے دیا گیا تھا مگر قصر ایمن میں رہنے والوں کے لئے آفت زدہ علاقہ اگر کوئی تھا تو وہ ان کی محل نما کوٹھی تھی۔

جس میں یہ طوفانی بارش بھی اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ آنکھوں والے ہوتے
تو اسی کو دیکھ کر خوش ہوتے مگر وہاں تو مردوں سمیت ایکو ایک بلا کا ڈرپوک تھا۔
یوں تو چوہوں اور چھپکلیوں سے بھی ڈرتے تھے مگر متضاد ڈر ٹیکے کا تھا اور کسی چیز کا نہیں تھا،
اور اپنی کوٹھی یا گھر والوں سے آگے تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ خبروں میں ہوا کے دباؤ
کے ساتھ حبس اور بارش کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ تو ایک ساتھ ان گنت آوازوں نے کہا۔
" ہائے اور بارش ۔"
" یا اللہ خیر " ممانی نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح لپیٹا۔
" ہاں ہو گی۔ آثار کہہ رہے ہیں۔ " خالہ کی عادت تھی کسی بات کی تصدیق ہو جانے
کے بعد اسے یوں بے نیازی سے دہراتے جیسے برسوں پہلے پیش گوئی کر چکے ہیں۔
" کیا ہوا، کیا کہا۔ ؟ " نانی دور تخت پر سے پکاریں۔
" اور بارش " لڑکیاں چلائیں۔
" یا مولی اب تو رحم کر اپنے محبوب کے صدقے یا دنیا کو ڈبو کر چھوڑے گا۔"
" ڈوبے گی دنیا اگر گناہوں کا یہی عالم رہا۔ خدا مسلمانوں کو جھنجھوڑ رہا ہے اب بھی
ہوش میں آجاؤ۔ " ممانی ہر وقت کے تاشوں سے بے حد نالاں تھیں۔ " دیکھ لو ہر اسلامی ملک پر
آفت آئی ہوئی ہے کہیں جنگ، کہیں زلزلے، اور کہیں بارشیں۔ " وہ بڑی باقاعدگی سے،
" جنگ " کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ حال ہی میں ترکی میں پھر زبردست زلزلہ آیا تھا۔ اور مشرق
وسطی پر جنگ کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے مگر دراصل وہ ان چیزوں سے اتنی
پریشان نہیں تھیں جتنی گھر میں ہونے والے تاشوں سے۔
" اے ہے مسلمان کدھر ہے، آیا کہ نہیں ابھی تک ۔" نانی بولیں۔
" کوئی بھی نہیں آئے ۔"
" ہے ہے مولی اسے اپنی اماں میں رکھیو۔ لڑکیاں کتنی بھلی ہو گئی ہیں۔ اور

وہ اندھا دھند گاڑی چلائے ہے۔" نانی بے چاری کو کیا پتہ کہ سڑکیں بسلنی نہیں ہوگی ہیں بلکہ نہروں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

"آ گئے ہیں کب کے اپنے کمرے میں لیٹے ہیں" سوکھے اجو ملازم نے اپنے خاص چڑچڑے انداز میں اطلاع دی۔

"اللہ تیرا شکر دلہن اسے جاکر دیکھو دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کہیں بارش میں بھیگا نہ ہو۔ کپڑے بدلوا دینا۔"

"چائے بنوا دو۔" ممانی بولیں۔

اجمل برآمدے میں کھڑا یہ ساری لے دے بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سلمان بھیا چیونٹی کی رفتار سے کار لے کر ابھی کے واپس آکر اپنے کمرے کے پردے کھینچ اوندھے منہ پڑے تھے اور بیٹھک کے پردے برابر برابر کر باقی سب ایک جگہ اس لئے جمع تھے کہ ایک دوسرے سے ذرا حوصلہ رہے۔ مرد بے چارے تاش صرف اس مارے کھیلتے تھے کہ ذرا دھیان بٹا رہتا تھا۔ بارش کی تڑ تڑ ہلکی اور گرج ذرا دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اجمل نے ابھی سر سے پیر تک شرابور کپڑے تبدیل کئے تھے۔ اور وہ برآمدے کی بے حد سر سبز بیلوں میں گیلی چڑ چڑیوں کو پناہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے کا چوڑا نالہ پر ہو کر بہہ نکلا تھا۔ اور اب پانی گیٹ سے اندر داخل ہو کر صحن میں بھر رہا تھا۔ چھوٹے گملے پانی میں ڈوب چکے تھے۔ صرف پودوں کی سبز پھنگیں باہر نکلی رہ گئی تھیں۔ گھر کی کرسی بہت اونچی تھی۔ گھر کے اندر پانی آجانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اسی اطمینان کے پیش نظر اسنے گھر والوں کو اس خبر سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ سب کے ایک ساتھ بے ہوش ہو جانے کا ڈر تھا۔ پانی پٹاپٹ برسے جا رہا تھا۔ بجلی رہ رہ کر یوں چمک رہی تھی جیسے ہلکے نیلے رنگوں کی ٹیوب بار بار جل بجھ رہی ہو۔ ہر طرف گرتے پرنالوں کا بے پناہ شور تھا۔ مگر اس شور سے کم تھا جو وہ لیاری ندی کے بہاؤ میں دیکھ کر آیا تھا۔ لیاری

ندی اپنی آغوش میں سوئی ہوئی جھگیوں کو اسی طرح بازوؤں میں سمیٹے ابل کر بہہ نکلی تھی۔
کناروں پر بنی ہوئی ساری جھونپڑیاں بھی بہہ گئی تھیں۔ لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے اور
ادھر بنی عمارتوں اور اسکولوں میں پناہ لی تھی۔ پل کے دونوں کناروں پر یہاں سے وہاں
تک جھکے ہوئے مرد ندی میں بہتی ہوئی اپنی جھونپڑیوں کی زیارت کر رہے تھے۔ ان کے
ننگے بدنوں پر بارش کی بوچھاڑ بے اثر تھی۔ اور گرج چمک کا تو انہیں احساس تک نہیں تھا
اس لئے کہ فکر کرنے کو اور بہت سی باتیں تھیں۔ کپڑے بہہ گئے، بچھونے بہہ گئے، راشن
بہہ گیا۔ ٹوٹے ٹین اور ڈبے تیرتے ہوئے چلے گئے۔ کائی لگی سیاہ جھولتی چارپائیاں چلی گئیں
میلے چیکٹ چھلنی بنیان اور تہمد چادریں بہہ گئیں۔ کبوتروں کے کابک اور ان کے اڈے بہہ
گئے۔ غرضکہ ان کی زندگی کی ہر ضرورت اور ہر آسائش بہہ گئی تھی اور وہ پل پر جھکے یہ تماشہ
ایسے مزے سے دیکھ رہے تھے جیسے کشتیوں کی ڈور یا پیراکی کا مقابلہ دیکھ رہے ہوں۔
یا ٹھوں وزنی اس مچھلی کا نظارہ کر رہے ہوں جو کراچی کے سمندر میں کبھی کبھی آنکلتی ہے۔
ہلکے سبز رنگ کی ننھی سی چڑیا ایک شاخ سے پھدک کر دوسری پر آبیٹھی اور اجل کی
طرف بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا بالکل اس چڑیا کی طرح بھولا اور
معصوم، اسی کی طرح گیلی اور سہمی ہوئی۔ گیلے بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں اور آنکھوں میں
بھرتا ٹپکتا پانی۔ بڑی موٹی پلکیں اور زندگی کی حد کو چھوتے ہوئے گلابی ہونٹ۔ گالوں پر
پانی کی بہتی بوندیں اور آنکھوں میں ہلکی سی وحشت۔ بالکل ہرنی کی طرح بھڑکی تھی جب
اس نے ہاتھ کو پانی کے گڑھے سے نکالا تھا۔ سنا ہے ہرنیاں بھی آہستہ آہستہ رام ہو جاتی
ہیں مگر یہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ امی اور بہنیں تو بڑی بڑی کوٹھیوں میں رشتے ڈھونڈ رہی ہیں
بارش سے پہلے یہ مہم خوب زوروں پر چل رہی تھی۔ جب بھی وہ کوٹھیوں سے گلاب، جامن،
کیک اور پھلوں سے پیٹ بھر کر لوٹتیں تو ان کے منہ لٹک رہے ہوتے۔ اترتے ہی امی کہتیں،
"اچھی شکل کی لڑکیاں تو اٹھ گئی ہیں کراچی سے........ بھئی سب کچھ ہے مگر لڑکی

کسی کام کی نہیں۔ اتنا بڑا وصانہ اللہ میری توبہ اور رنگ...... رنگ کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔" اس کے بعد لڑکی کے گھر اور ان کی خاطر داری کی تعریف شروع ہوتی۔ اجمل سوچتا تھا اگر کوئی چھوری عورت چاہے تو اس شہر کراچی میں لڑکیاں دیکھنے کے بہانے سال کے تین سو پینسٹھ دن موج کر سکتی تھی۔ اجمل نے خود کبھی بھی کسی پری رو کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ مگر گھر میں ہمہ وقت یہی چرچا تھا کہ بہویں خوبصورت ہونی چاہئیں یہاں تک کہ ابا کہتے تھے اور کچھ نہ ہو رنگ تو گورا ہو کالے بچے تو بھئی ہم سے ایک منٹ کو برداشت نہ ہوں گے اور واقعی انہوں نے زندگی بھر کبھی کسی کالے آدمی کو برداشت نہ کیا تھا گھر کے لوگوں کی اور بات تھی۔ اور اب تو اجمل کو بھی شک ہو چلا تھا کہ کراچی سے گورا رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے بازار سے اصلی گھی، لیکن یہ اسنے کیا دیکھا تھا۔ آفتاب یا ماہتاب۔ میوڑہ پر ایک کلرک جو ہر ہاتھ آجانے والے کو اپنی زندگی کی داستان سنانے کا شوقین تھا۔ اس سے ایک دن یوں گویا ہوا تھا۔ "ارے ایٹروی اپنی شادی بھی عشق کی شادی تھی عشق کی۔ ایک دن فٹ بال کھیل کے آیا تھا۔ بنیان پہنے پلنگ پر لیٹا تھا۔ سامنے جو نظر اٹھی تو کیا دیکھا دو ماہتاب۔ بس اسی وقت اماں کے پاس گیا اور کہا اسی سے شادی کراؤ بڑے ماہتاب سے۔ اماں نے مجبور ہو کر رشتہ بھیجا۔ تمہاری بھابھی کا ابا تھا مولوی، بولا تمہارا لونڈا کچھا پہنتا ہے۔ یہ شادی نہیں ہو سکتا۔ بس یار اپنی کی جان پر بن گئی۔ کسی چیز کا ہوش نہیں تھا بھئی۔ گھر سے جاتا ایک باغ میں لیٹ جاتا۔ لوگ لڑکا پاگل سمجھ کر پتھر مارتا۔ یہ دیکھ کر ہمارا ابا ایک دن مولوی کے پاس گیا اور بولا سالا ہمارا بیٹا مر جائے گا۔ تمہارا کیا جائے گا۔ ایک نمبر ہمارا بیٹا ہے گھر کا فٹ بال کا کھلاڑی نمبر ون چیمپین ہے سالا، پتہ نہیں کیا کیا بولتا۔ آخر داڑھی والا بڈھا مان گیا۔ اور یوں اپنی شادی ہوا تمہاری بھابی سے، کبھی آکر دیکھو ایک نمبر ماہتاب ہے اب بھی!" اس سیاہ فام بھینگے کلرک کو ماہتاب میسر آسکتا ہے تو کیا وہ ایسا گیا گذرا ہے...... ایک دن

امی نے جل کر کہہ دیا تھا "بس جی اب زیادہ دیر کرنی مناسب نہیں، قسمت میں گوری لڑکیاں نہیں تو کیا کریں اور تو سب کچھ ہے۔"

ابا نے اور بھی جل کر کہا تھا "نہیں چاہیے ہمیں کچھ بھی، بس گورا رنگ چاہیے۔ اچھی شکل چاہیے۔"

"لو اور سنو کسی جاہل کبڈ کو لے آئیں گے؟"

"ہاں۔" ابا نے غصے میں تنتناتے ہوئے کہا تھا۔

"جھونپڑی والی کر لائیں گے؟"

"ہاں۔" ابا نے گردن اور بھی تان لی تھی۔

"تو بسم اللہ —— میں تو آج کے بعد کہیں جاؤں گی نہیں لڑکی دیکھنے، آپ کو جو راہ چلتی گوری بھکارنیں نظر آئیں لے آئیں کہ چلو میرے بیٹوں کا گھر باؤ۔"

"لے آئیں گے ہم۔" اب ابا کے فقروں میں صرف مابدولت لگانے کی کسر تھی! اجمل دل ہی دل میں اپنے ابا اور امی کی باتوں پر خوب ہنستا تھا۔ سارا دن ان میں یوں ہی بچوں کی طرح چونچیں ملتی تھیں۔ کیا مجال جو کبھی ایک بات پر متفق ہو جائیں۔ ایک پورب کی کہتا تو دوسرا پچھم کی۔ اب اگر وہ اس مٹھائی کا ذکر ابا سے کر دے تو امی سے بحث کی اور بات ہے اسے معلوم تھا کہ امی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بات مان بھی لیں گی مگر توپ و تفنگ تک بات تو ابا ہی پہنچائیں گے۔ اکثر وہ کوئی چیز لا کر ابا سے کہا کرتا تھا "ابا یہ لایا ہوں۔"

"کیا ہے بھئی؟"

"پتلون کا کپڑا ہے؟"

"کس کے لئے ہے؟"

"اپنے لئے لایا تھا آپ کو پسند ہے تو آپ رکھ لیجئے۔"

"واہ واہ یہ بھی بہت اچھا ہے، ہمارے کس کام کا اپنی بنواؤ خوش رہو۔"

اسی طرح اگر ایک دن چپکے سے ماہتابی کو لاکر کھڑا کردے اور کہے ابا یہ لایا ہوں مگر جی توبہ کرو ابا ایک دم بپھر جائیں گے۔ کیا کہا...... گھر نہ در...... اچھا تو اب ہم جھونپڑیوں میں براتے کر جائیں گے' صاحبزادے اس گھر سے منہ کالا کرو اور خبردار جو کبھی ادھر کا رخ کیا۔"........ اگر وہ اتنی معصوم ہی نہ ہوتی۔ الو کو کچھ معلوم ہی نہیں کہ دنیا کیا ہوتی ہے' دنیا والے کیا ہوتے ہیں۔ اپنے اوپر غضب کا اعتماد مگر یہ اعتماد لاعلمی کا ہے جیسے ہارڈی کی ٹیس بے چاری کو تھا۔ کس بلا کی خراب ہوئی بے چاری کی زندگی ایک انجلنے حادثے کے پیچھے۔ اگر کسی دن اس کو بھی کوئی اس نہج کا مل گیا اور مل ہی جائے گا۔ ایسے لوگوں کی کراچی میں کمی ہے۔ بدبخت اگر اتنی حسین ہی نہ ہوتی۔ تھوڑی سی کالک ہی مل لیا کرے اپنے چہرے پر' ذرا سی مٹی ہی تھوپ لے۔ ماں بھی تو اتنی سیدھی ہے اسی کو معلوم ہونا کہ وہ کیا موقع کھلے خزانے چوروں کے دیس میں لئے پھر رہی ہے۔ کل جو وہ گیا ہے تو گیلی چارپائیوں پر کیسے فراغت سے ہاتھ پر دھرے بیٹھے تھے۔ کسی کو کوئی کام ہی نہ تھا کرنے کو۔ ٹپ ٹپ گرتی بارش میں سب سے بڑے بیٹے اپنے ماضی کو رو رہے تھے اور وہ پاس کے ادھ بنے کمرے کی بغیر پٹ اور شیشوں کی کھڑکی میں دو چار ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہاتھ باہر نکالے بوندیں پکڑنے کی کوشش میں کھل کھل ہنس رہی تھی۔ ایک بوڑھا مجذوب بارش میں بھیگتا چوہا بنا یکایک چلا اٹھا تھا۔ "دیکھو دیکھو کراچی میں کیسی آگ لگی ہے۔ چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔ زمین آگ اگل رہی ہے۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے۔" وہ چاروں طرف اشارہ کر کے بڑبڑا کے جا رہا تھا۔

"ارے بڑے میاں یہ آگ ہے یا پانی؟" کسی منچلے نے اسے چھیڑا۔ "تو دیکھو چاروں طرف پانی ہے اور بڑے میاں کو آگ نظر آ رہی ہے۔ ارے آگ ہوتی تو اس پانی سے بجھ نہ جاتی۔

بڑے میاں نے اس کی بے وقوفی پر قہقہہ لگایا اور تمسخرانہ انداز میں کہا: "آگ پانی سے کہاں بجھتی ہے میاں، جب آگ لگتی ہے تو پھر کسی چیز سے نہیں بجھتی، سب کچھ خاک کر کے ہی بجھتی ہے، راکھ ہو کر ہی بجھتی ہے...... اف اف دیکھو کیسی آگ لگی ہے" اجمل ملکر تی لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے بڑھا پھر اپنی بڑبڑاہٹ میں گم ہو گیا۔

"پانی! ہونہہ پانی سے کیا ہوتا ہے۔ پانی نے کسی محل، کسی کوٹھی، کسی بنگلے کو گرایا...... یہ آگ ہے جو جھونپڑیوں اور محلوں میں تمیز نہیں کرتی...... یہ جب جلانے پر آتی ہے تو سب کو جلاتی ہے۔ آگ انصاف پسند ہے...... پانی بے انصاف ہے، غریبوں کو ڈبوتا ہے، غریبوں کو بہاتا ہے...... ارار دیکھو کیسی زبردست آگ ہے" بوڑھے مجذوب کی باتیں سنکر اجمل کا دل خوف سے منجمد ہونے لگا تھا رہتا بچی بھی ڈر گئی تھی۔ اس کا دھیان ہٹانے کے لئے اجمل نے کپڑوں کی گٹھری اس کی طرف بڑھائی تو اس نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے پیچھے کر لیا۔ اور کہا "اماں کو دے دو یا نہ دے دو بھی" اس نے نہ کہا جیسے لینے دینے کی بات منہ سے نکالتے ہی اسے تکلیف ہوتی ہے لوگ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ بھاگوان کہاں سے کپڑوں کا گٹھر لایا ہے جب بھید کھلے گا تو...... اجمل نے دیکھا کہ سامنے سے چچا گیبی چلے آرہے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے بے موقع آٹپکتے تھے غیر متوقع بارش کی طرح۔ دراصل ان کو گپ مارنے کا جو مرض ہے وہ گھر پر ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا۔ بیوی ان کے منہ پر کہہ دیتی ہیں "ارے بیٹھے دو میرے سامنے بے پر کی نہ اڑایا کرو" ماں کی دیکھا دیکھی بچے بھی۔ ان کی باتوں پر ہنس دیتے ہیں۔ یا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اسی لئے گپوں کا پشتارہ لئے وہ تیرا میرا گھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ سب سے بے وقوف پھلاک شائد انھیں اسی گھر میں ملی تھی کہ جب دیکھو تب آن موجود۔ اجمل نے سوچا جس وقت صور پھونکا جا رہا ہو گا۔ قیامت کی نفانفسی ہو گی اس وقت بھی یہ دوڑے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے ــــ

"تمہاری طرف قیامت کی وہ رونق نہیں جو ہماری طرف ہے۔ اجی ہماری طرف تو ہمالیہ کا پورا سلسلہ یوں اُڑتا ہوا گذر رہا ہے جیسے ٹڈی دل اور سنو تو یہاں تو سورج بھی ذرا دور ہے وہاں تو عین سوا نیزے پر ہے ابھی ناپ کر آ رہا ہوں"۔ غرضیکہ جو چیز ان کی ہوگی وہ بہتر ہوگی۔ جو سماں انھوں نے دیکھا وہ ظاہر ہے کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔ اور جو کچھ ان پر بیتی ہے وہ تو ہونی ہی ہے ہمیشہ ناقابل یقین۔ مگر جب تک وہ سننے والے کو اس بات کا یقین نہیں دلا دیتے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کیا گپیں تھیں ان کی۔ شروع میں جب ٹیڈی پیسہ چلا ہے تو انھوں نے دس پندرہ آدمیوں کے مجمع میں فرمایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں جب پائی چلتی تھی اس کی یہی شکل اور یہی وزن تھا جن لوگوں کے پاس وہ پائیاں پڑی تھیں وہ اب ان پیسوں کی جگہ چلا کر لکھ پتی بن گئے ہیں۔ ان کی اس بات پر لحاف میں منھ دے کر وہ گھنٹوں ہنستا رہتا تھا۔ جب اس بات پر غور کرتا تھا اتنی ہی ہنسی قابو سے باہر ہوتی جاتی تھی۔ پائیوں کو جمع جمع کرنا..... پھر ان کو پیسوں کی جگہ چلانا..... اور لکھ پتی بن جانا— بعد میں اس نے یہ چاہا تھا کہ یہ لطیفہ اپنے دوستوں کو سنائے مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ کون یقین کرے گا بھلا۔ سب اسی کے دماغ کی اختراع سمجھیں گے۔ اور ایک دفعہ ایک بزرگ کے سامنے یہ ایک نامور قاتل کو صفا بچا لینے کی ڈینگ مار رہے تھے۔ اجی صاحب میں نے یہ کہا کہ ایک ریلوے ٹکٹ چیکر سے یاد اللہ تھی اس سے کہا کہ اس کو فلاں تاریخ کو بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑ لو، بس جناب اس نے اس تاریخ کا میمو کاٹ دیا۔ پیسے رکھوائے۔ کورٹ میں ثابت ہو گیا کہ قاتل تو اس دن وہاں تھا ہی نہیں وہ تو

بریلی اسٹیشن پر موجود تھا۔ تو صاحب صاف بچ گئے۔ ایسی باتیں سن سن کر جیب
اس کے کان پک گئے" تو ایک دن اس نے ان سے پیچھا کرنے کی ٹھانی۔ وہ ریڈ
کے نل سے گملوں میں پانی بھرے رہا تھا کہ آ گئے اور بولے۔" یہ کیا پھول ہیں۔
پھول تو صاحب ہمارے آبائی گھر میں تھے (اجمل کو معلوم تھا کہ وہ ایک سڑے
ہوئے محلے کے خستہ مکان میں رہتے تھے) گلاب کا ایک پودا تھا جس کی ایک
شاخ میں سیاہ گلاب کھلتا تھا۔ دوسری شاخ میں زرد اور تیسری شاخ میں سُرخ
دور دور سے لوگ اس پودے کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اپنا انگریز
کمشنر کیا بھلا سا نام تھا اس کا......

" اچھا" اجمل نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ " مگر آپ نے اس
پودے کے کرشمے نہیں دیکھے" اس نے ایک سوکھے سے کیکٹس کی طرف
اشارہ کیا۔ " اس میں ایک دن گلاب کھلتا ہے، دوسرے دن لگتی ہیں جامنیں
اور تیسرے دن شاخیں گلاب جامنوں سے لدی ہوتی ہیں۔ یقین نہ ہو تو تین
دن رہ کر دیکھ لیجیے۔" اس دن سے چچا خالو نے اس کا سلام لینا چھوڑ دیا تھا۔
اور اسے اپنے کانوں میں عجیب سا سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے بہت دیر
سے بھن بھن کرنے والی مکھی دفعتاً کہیں ہجرت کر گئی ہو۔ اب حتی الامکان وہ
ان کے سامنے نہ پڑتا تھا۔ پانی میں چھپا چھپ کرتے وہ اندر آ رہے تھے جوتے
ان کے ہاتھ میں تھے۔ نزدیک دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں کھسک گیا اور ان
کے اندر چلے جانے کے بعد پھر آن کر کھڑا ہو گیا۔

پہلے سلام کی آوازیں ابھریں پھر ممانی نے کہا۔ " کیسے آئے
آپ اس وقت؟"

"بس آ گیا۔ دفتر سے جو نکلا تو سڑک پر سات آٹھ فٹ پانی، کچھ لوگ کشتیوں میں سنبھال کر لوگوں کو گہرے پانی سے نکال رہے تھے۔ میں بھی اسی پر بیٹھ کر آیا ہوں۔ دو روپے کشتی والے کو دیئے۔" کسی نے ان کی بات پر شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ سب کو معلوم تھا کہ جس جگہ سے یہ آ رہے ہیں وہاں تین فٹ پانی ہے اور سبزی کے ٹھیلے والے اپنے ٹھیلوں پر بٹھا کر نازک مزاج لوگوں کو باہر نکال رہے ہیں۔

"اور بھی کہیں گئے تھے؟" نانی نے پوچھا۔

"ہر جگہ دیکھی ہے، بارش سے پناہ لینے والوں کی طرف بھی گیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ سیکڑوں آدمیوں کے مجمع میں کل چار بوریاں آٹے کی آئی تھیں۔ چار اور جناب جب ایک صاحب نے ڈبہ بھر کر آٹا نکالا اور ایک آدمی نے جھولی پھیلائی تو فوٹو گرافر نے جھٹ سے تصویر لے لی۔ آٹا انھوں نے واپس بوری میں ڈال دیا اور چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا۔" جاؤ جاؤ بابا اپنا کام کرو تقسیم شام کو ہوگی۔ یہ تو یونہی تصویر کھنچوانے کے لئے تھا۔ اخبار میں جانی تھی، تو یہ حال ہے صاحب۔ یہ ہوتا ہے ہمارے ہاں۔"

"ہاں یہی ہوتا ہے، قومی شعور ہی مر گیا ہے....... بیٹھ پھینکئے بھاتی جان ــــــ گھٹنے گھٹنے تک کپڑے اٹھا کر پانی میں کھڑے رہتے اور تصویریں کھنچوانے سے لوگوں کی مشکلات تھوڑا ہی حل ہو جائیں گی........ ارے ارے یہ کیا چل دیا آپ نے۔"

"نہیں بھیا مشکلات تو تاش کھیلنے سے حل ہوں گی"۔ جلی

ممانی بھی کام کی ایک بات کہہ ہی گئیں جسے سب نے سنی ان سنی کر دی۔

"میں پوچھتا ہوں جب انھیں معلوم تھا کہ بارش ہونے والی ہے تو انھوں نے پہلے سے کچھ کیوں نہیں کیا۔"

"اپنے عالم صاحب دو دن سے فون کے پاس بیٹھے تھے۔ کہتے تھے گھر سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔ فون پر بیٹھا ہوں، کراچی میں بڑی زبردست بارش ہونے والی ہے۔ ارے صاحب میں پوچھتا ہوں فون پر بیٹھے رہنے سے بارش رک جائیگی یا لوگ بچ جائیں گے۔ انھیں چاہیے تھا کہ پہلے سے لوگوں کو خطرے سے باہر نکالتے۔"

"کس کس کو نکالتے، عوام کو بھی تو اطلاع دے ہی دی گئی تھی وہ خود کچھ کرتے۔" ممانی بولیں۔

"وہ کیا کرتے وہ تو یہ سمجھتے رہے کہ ہمیشہ کی طرح اب کے بھی پیشین گوئی غلط نکلے گی۔ انھیں چاہیے تھا کہ جتنوں کو نکال سکتے تھے نکالتے یہ کیا کہ مزے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔"

"آپ تو خود اس دن سے گھر میں چھپے بیٹھے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم۔ انھوں نے کیا کچھ کیا۔" اب کے خالہ بھی بولیں۔

"ہمیں معلوم ہے سب۔ کچھ نہیں کر سکتے یہ — سب کو اپنے جلوے مانڈے سے کام ہے۔ قومی شعور...... اوہو یہ کیا کیا آپ نے پان؟ تو یہ کاٹ رہے ہیں۔ چہ..... چہ..... ساری بازی کا ستیاناس ہو گیا۔"

"شاباش کہ ایک گنے، ایک چھوٹے سے گنے کو آپ ہی نے

"نکال کر اپنے خالی کوارٹر میں جگہ دے دی ہوتی۔" احمل نے دکھ سے سوچا۔ "قومی شعور حکومت کے کارندوں ہی کو الاٹ ہوتا ہے کیا؟"

"ارے تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" جانے امّی کیسے بھولے سے یہاں نکل آئیں۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کب آئے کیا حال تھا منوڑہ کا؟ میرا تو ڈر کے مارے برا حال تھا۔"

"سمندر میں لاشیں بہہ بہہ کر آرہی تھیں۔"

"اے ہے، صبح ہی کہہ رہی تھی نہ جا، یہ کوئی موسم ہے باہر جانے کا۔"

"کیا اچھی ہے، ارے اسے ادھر بھیجو میرے پاس۔ صبح سے دعا مانگتے مانگتے یہ وقت آ گیا ہے اور یہ آکر چپ چاپ بیٹھ گیا۔" نانی دور سے پکاریں۔ تو وہ جا کر فرماں برداری سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"سمندر کا تو آج برا حال ہوگا، کیوں اچھی۔" مارے گھبراہٹ کے ان کا اپنا برا حال تھا۔

"جی وہ .... نہیں سمندر تو خشک پڑا تھا۔" ان کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اس کے منہ سے نکل گیا۔ لڑکیوں میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ "ہاں خشک تو پڑا ہی ہوگا۔ سارا پانی تو بادل بن کر اڑ گیا۔"

"اور راستے کا کیا حال تھا۔؟"

"کہیں کمر تک پانی تھا کہیں گھٹنوں تک۔ راستے میں بہت سی

بسیں خراب ہوتی کھڑی تھیں۔ ٹیکسیوں نے میٹر ڈاؤن کر رکھے تھے۔ یک مشت رقم مانگتے تھے، دس پندرہ روپے سے کم کہیں کا کرایہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری ٹیکسی خراب ہو جائے گی تو کون ذمہ دار ہوگا۔"

"ہاں ہاں وہ تو مانگیں گے ہی ان کی بن آئی ہے ۔۔۔ پیتہ پھینکئے بھائی جان۔"

"کھانا کھا لیا؟"

"کھا لیا تھا ایک دوست کے۔۔۔۔۔۔ ہاں۔"

"کہاں؟"

"بہار کالونی میں رہتا ہے وہ۔"

"ارے وہاں کہاں چلے گئے تھے ۔۔۔ یہ موقع ہے ایسی جگہ جانے کا۔" ابا نے ڈانٹا۔

واقعی بہار کالونی اور وہاں کا راستہ۔۔۔۔۔۔ تو بہ۔۔۔۔

سب جگہ پانی ہی پانی تھا۔ صاف شفاف، نکھرا ستھرا پانی نہیں، کالا سیاہ دنیا بھر کی غلاظت سمیٹ کر چپ چاپ پڑا ہوا پانی۔ اس پر لی مارکیٹ سے گذرتے ہوئے مچھلیوں کی بو ۔۔۔ کئی جگہ اسے ابکائی آئی۔ دوست کے مارے اس نے ناک پر رومال نہیں رکھا اور دوست نے شاید اس کی شرم سے۔ مچھلیوں اور گٹر کے کالے پانی کے آگے کوڑے کے ڈھیر۔ گھروں کے آگے اور گلیوں میں یوں بچھے ہوئے جیسے بڑے آدمیوں کی آمد پر بچھائے ہوئے مخمل و بانات۔ سامنے ابلتی ہوئی بھورے پیالی ندی اور اس کے پار اندھے روشن دانوں اور ٹوٹی چھتوں والے بھائیں بھائیں کرتے خالی مکان جو

کبھی آباد تھے۔ اور آبادی کی ریل پیل سے بچوں کی لہر بہر سے بند توڑ دینے
والی لیاری کا نقشہ پیش کرتے تھے آج کیسی سونی سونی آنکھوں سے تاک رہے
تھے۔ پانی میں ڈوبی اینٹوں پر چھپ چھپ کرتے جب وہ اس کوارٹر نما گھر
میں پہنچے اور دوست کھانا لانے اندر گیا تو معلوم ہوا کہ آج گھر میں کچھ بھی نہیں
پکا۔ ان کے گھر میں سال اور مہینوں کا راشن نہیں پڑا تھا۔ روز کنواں کھودتے
تھے روز پانی نکالتے تھے۔ دو دن سے ابا کنواں کھودنے نہ جا سکے تھے چنانچہ
پانی بھی نہ نکلا تھا۔ دوست نے بڑے خفیف ہو کر یہ بات کہی تھی اور اس نے کہا تھا
کوئی بات نہیں آؤ اور کہیں کھا لیتے ہیں۔ اب وہ میزبان تھا اور دوست مہمان،
اس علاقے میں کسی اچھے ہوٹل کی تلاش بے سود تھی چنانچہ کوڑے کے ڈھیر کے
زیر سایہ بنے ہوئے وہ ایک کچی دیواروں والے ہوٹل میں جا بیٹھے جہاں بدرنگ
میزوں پر مکھیاں یوں رینگ رہی تھیں جیسے مر کر بھی یہاں سے نہ اٹھیں گی۔
میزوں کے نیچے سیاہ کیچڑ تھی۔ اور چھت بھر سے ٹپکتا میلا پانی۔ لدھڑ مکھیوں
کا بوجھ اپنے کندھوں اور ہاتھوں پر سہتے ہوئے انہوں نے نان اور کباب
کھائے تھے اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہیضہ دانت نکوسے اس بے دروازے کے
ہوٹل کے آگے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہاں سے مختلف سواریاں
پکڑتا وہ بمشکل گھر پہونچا تھا۔

"تھوڑا سا کھالو، پوریاں پکائی ہیں آج لڑکیوں نے۔"

"اوہو تب تو واقعی بھوک لگ رہی ہے" لڑکیاں پھر کھلکھلا کر
ہنس پڑی تھیں۔

"پوریاں تو ٹھنڈی ہو گئی ہوں گی۔" مشتہلانے جو اس پر منصب

زیادہ مرتی تھی کہا تھا۔

"اور بنائے دیتے ہیں" زرینہ بولی تھی جو اس پر سب سے زیادہ عرصہ سے فدا تھی۔

لڑکیاں ڈرتی اندر ہی اندر کہ آسمان کی بجلی انھیں دیکھ نہ لے باورچی خانے میں جاکر پوریاں تلنے لگی تھیں۔ مگر تہمینہ اور باجی رخسانہ وہیں بیٹھی رہی تھیں۔ اجمل کا تجربہ تھا کہ سگی بہنیں ایسے موقعوں پر کبھی بھی جوش کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ وہ ڈٹ کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ لڑکیاں باری باری گرم گرم پوری لا رہی تھیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تازہ پوری آنے پر وہ پہلے سے خالی ہاتھ نہ بیٹھا ہو۔ باورچی خانے میں اس کی بسیار خوری مذاق بنی ہوتی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ آخر تہمینہ نے آکر الٹی میٹم دے دیا "کمال ہے کتنا کھائیں گے بس کیجئے آٹا ختم ہو گیا" لڑکیاں اور آٹا گوندھنے کو تیار تھیں مگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا "اچھا تو لو...... اللہ تیرا شکر۔"

تہمینہ کے جانے کے بعد اس نے پوریوں کے ہر تیمض کے تھیلے کو بڑے جتن سے اپنی الماری میں چھپایا اور پھر آکر برآمدے میں کھڑا ہو گیا، یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس پر دم دینے والیوں کی آتے ہوتے جاتی تھی۔ اور وہ گھر والوں سے محفوظ رہ کر یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ بارش رکنے کا انتظار کرے یا ابھی پوریاں اس تک پہونچا آئے شاید وہ آج بھی اس کے انتظار میں بھوکی ہو۔ جس وقت ہاتھ پکڑ کر اس نے گڑھے میں سے شہابی کو نکالا تھا اور پھر اس کی پریشان حالی دیکھ کر ٹیکسی میں بٹھا لیا تھا تو اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آخر وہ ان ماں بیٹی کو کہاں لئے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انھیں گھر لاکر

مالک کے حوالے کر دیتا کہ ناظم آباد کے ایک نوتعمیر مکان میں اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو بارش سے پناہ لینے یہاں آ گئے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے یہیں ٹیکسی رکوا لی۔ ماں بیٹی کو اتارا۔ کوشش کر کے ان کے لئے چارپائی اور بستر مہیا کیا۔ اور پھر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھپر چھپر کرتا بازار سے انھیں کھانا لا کر دیا۔ اور چلتے وقت یوں ہی روا روی میں کہہ گیا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں پھر آؤں گا۔" دوسرے دن جب وہ شام کو پہونچا ہے تو وہ کھل کھل ہنس رہی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کل کی بھوکی ہے۔ اس کی ماں نے بتایا۔ "بیٹا جب کل راشن بٹنے لگا تو یہ بیگی بولی۔" اماں ہمارے لئے تو وہ لے ہی آئیں گے پھر دوسری چیزیں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی اور کا بھلا ہونے دو۔ تب سے بیٹے وہ بھی بھوکی ہے اور میں ...... میں نے تو خیر ان سے کچھ لے کر کھا لیا ہے۔" اس نے پڑوس میں پڑے ہوئے کنبے کی طرف اشارہ کیا اور تب اس نے سوچا اس سے جا کر کہے۔ "اے لڑکی پاگل ہو گئی ہے تو ـــ میں نے ہاتھ پکڑ کر کھیتے گڑھے سے نکالا کہ میں ساری عمر کے لئے تیرے نان نفقہ کا ذمہ دار ہو گیا۔ ارے تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس طوفانی بارش میں تیرے لئے میں شام کو بھی کچھ لے کر آؤں گا۔" لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ جب کبھی آپ پر کوئی ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر بیٹھے تو اس کے اعتماد کو چکنا چور کرنے کے لئے پتھر کا جگر چاہئے۔" اجمل بھی اس سے کچھ نہ کہہ سکا اور یہ بات اس نے کہی کب تھی۔ وہ تو اسے دیکھ کر کھل کھل ہنسی روک کر دم بخود ہو گئی تھی۔ اس نے بڑھ کر فلمی ہیروئنوں کی طرح یہ نہیں کہا۔ "میرے لئے

کیا لائے بابو۔ میں تمہارے انتظار میں کل کی بھوکی ہوں،" بلکہ شاید اس خیال کے آنے ہی سے اس کے گلابی گال گہرے ہو گئے تھے۔ پلکوں کی لمبی چادریں پٹاپٹ آنکھوں پر پڑ گئی تھیں۔ وہ ضرور آج بھی بھوکی ہو گی بے وقوف لڑکی۔ اجمل نے چپکے سے اندر جا کر پوریوں کے تھیلے کو ایک میز پوش میں لپیٹا اور چھپ چھپ کر تا دروازے سے باہر نکل گیا۔

گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا ہائے کم بخت یہ دھوبی کپڑے کب لائے گا؟

"اب کیا لائے گا پہلے ہی رلا رلا کر دیتا تھا۔ اب تو بہانہ مل گیا۔"

"ہائے غضب تو یہ ہوا کہ میری نئی قمیض جو میں نے ڈرائی کلین کے لئے رکھی تھی وہ بھی لے کر چلتا بنا۔ کم بخت نے اگر دھو دیا تو، تمہی وہ تو —"

"ہاں دیکھو تو کیسا چپ چپاتا گٹھر اٹھا کر چلتا بنا، اندر آتا تو میں اسے اپنی نئی قمیض، کھاتی سارا رنگ کاٹ کے لے آیا۔"

"اور میری شلوار کم تھی اتی۔"

"تو تم نے اسی وقت کیوں نہ کہا۔"

"کپڑے دیکھے کب تھے، اس نے گٹھر رکھا اور بولا میں ابھی آتا ہوں، آپ اپنے کپڑے لکھ کر رکھیں ...... بس پھر باہر سے باہر ہی کپڑے لے کر چلتا بنا۔"

"آنے دو کم بخت کو کیسی خبر لیتی ہوں، کیسے کملینوں کے

دماغ آسمان پر چڑھے ہیں ... کراچی میں۔"

یہ بات تو کئی دفعہ اجمل نے بھی محسوس کی تھی کہ جس دن یہ بڑے گھٹر کی دھلائی دھل کے آ گئی تھی دل بڑا ہلکا ہلکا محسوس ہوتا تھا۔ سفید براق قمیصوں اور پتلونوں سے جیسے آنکھوں میں روشنی آ جاتی تھی اور خواہ مخواہ گنگنانے کو جی چاہتا تھا۔

اور جب میلے کپڑوں کا ڈھیر گھر میں پڑا ہو تو دل پر بوجھ سا رہتا ہے، جیسے سوا من کا پتھر رکھا ہو۔ آدمی خواہ مخواہ چڑچڑا ہوئے جاتا تھا جیسے آج گھر والے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر ایک کو دھوبی کا انتظار رہتا سوائے ابا کے۔ اسے تو آج کل دھوبی راتوں کو خوابوں میں آ کر ڈرایا کرتا تھا۔ "کیوں میاں کب سے گیا تھا میں کپڑے؟" اور وہ خواب ہی میں دھوبی کے آگے ہاتھ باندھ لیتا "یار تجھے خدا سمجھے ذرا آہستہ بول۔" اگر امی اسے اس کیفیت میں دھوبی کے آگے ہاتھ باندھے دیکھ لیتیں تو کیا کہتیں۔ جس کو دیکھو یہی کہتا تھا۔ "کراچی میں ہر شخص کا دماغ آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔" اجمل تو مدتوں سے کراچی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس لئے اسے نہیں معلوم تھا کہ دوسری جگہوں کا کیا حال ہے اس سے یہ ضرور محسوس ہوتا تھا جیسے کراچی میں ہر شخص غیر مطمئن ہو، بڑے بڑے امیر کبیر تاجر بھی۔ بڑے بڑے مکان دار بھی کرایہ دار بھی مزدور اور رکشا والے بھی اور یہ بے اطمینانی اور مختلف قسم کی تھی۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے کسی اور کی چیز کبھی اگر بہت دنوں اس کے ہاں پڑی رہے تو پھر اس کی جدائی ناگوار ہوتی ہے۔ کوئی لے تو بے انصافی معلوم ہونے لگتی ہے جس کو دیکھو کہتا ہے اب کیا رکھا ہے یہاں۔ وہ پہلی سی بات نہ رہی، وہ پہلی سی تجارت نہ رہی۔ مکانوں

کے فلک بوس کرائے نہ رہے، وہ پگڈیاں نہ رہیں، وہ دھکم پیل نہ رہی اور تو اور اس کے ٹٹ پونجیا ہاتونی نائی نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ اس کا کاروبار بڑا مندا ہو گیا ہے۔" ارے کیوں گناہ سمیٹتے ہو کراچی کا ایک کونا بھی تو خالی نظر نہیں آتا۔ وہی شاپنگ کا عالم، وہی کاروں کی ریل پیل، وہی مکانوں کی گرانی، وہی بھیڑ بھڑکا۔ مگر دل کے یقین کو زبان کہاں تک بدلے گی۔ آخر یہ بے چینی تھی کس بات کی۔؟ اب اس دن مس فاطمہ جناح کے وزٹ کے وقت کیا ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ اپنا اسکوٹر سڑک پر سارجنٹ کے اسکوٹر کے نزدیک کھڑا کر کے پیٹرول پمپ میں گھس گیا تھا۔ اسی پیٹرول پمپ میں جس میں آگ لگا دی گئی تھی، شیشے تڑ اتڑ ٹوٹ رہے تھے۔ سامنے ایک ڈبل ڈیکر بس اور دونوں اسکوٹر دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ سفید بطخ کا سا اس خوبصورت اور پسندیدہ اسکوٹر اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ ڈھیر بن گیا تھا۔ بعد میں جب وہ رکشا میں بیٹھ کر دوبارہ اپنے اسکوٹر کی زیارت کرنے آیا ہے تو سڑک پر پانی ہی پانی تھا۔ جس میں جلی ہوئی بس تباہ حال کشتی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ دونوں اسکوٹروں کے انجر پنجر کرم خوردہ لاشوں کی طرح عبرت ناک تھے اس نے افسوس سے کہا تھا "یہ کوئی موقع تھا ہنگامے کا۔؟" اور رکشا والے نے فی البدیہہ کہا تھا۔ "بابا.......... موقع وقع کوئی نہیں ہوتا جب غصہ آتا ہے تو یوں ہی ہوتا ہے۔"

"کوئی بات بھی ہو غصے کی۔؟"

"غصے کی کوئی بات نہیں ہوتا..... جب روٹی نہیں

ملتی تو غصہ آتا ہے۔ جب تمہیں اپنے انسر پر غصہ آتا ہے تو تم کس پر اتارتے ہو اپنے ماتحتوں پر۔ ہم کو جب اپنے مالک پر غصہ آتا ہے تو ہم گھر جا کر اپنے بچوں کو مارتا ہے، بیوی کو مارتا ہے، گھر کی چیزیں توڑتا ہے۔ غصہ ایسی چیز ہے بابا... ..... تمہیں نہیں پتہ ہے زندگی کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارا دل کرتا ہے ابھی کہیں لیٹ جائے اور مر جائے بس"۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں بھائیں بھائیں کرتے سناٹے گونج رہے تھے اور اس کے بعد اس نے ایسی بے جگری سے رکشا چلائی تھی کہ موت اور زندگی کے فاصلے کئی دفعہ مٹتے مٹتے بچے تھے۔ یہ بے اطمینانی اس نے سارے ٹیکسی چلانے والوں اور مشورہ کے مزدوروں میں بھی محسوس کی تھی۔ اور ان لوگوں میں جو دوسرے ملکوں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آئے تھے۔ اور دن رات ذہن کے خواب دیکھتے تھے۔ جانے یہ لوگ کیا چاہتے تھے مگر اس نے تو شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا جن کے پاس تن کے پھٹے جوڑے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسری لڑکیاں اس گٹھری پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ اسے ڈر ہوا ایسا نہ ہو کہ سب چیزوں کے حصے بخرے ہو جائیں اور وہ جس کے لئے سارا گھر اگ کیا ہے خالی ہاتھ رہ جائے۔ اس لئے اس نے اچھا سا جوڑا جلدی سے الگ کر لیا تھا۔ تہمینہ کی قمیض جس کے سارے گریبان پر نیچے تک سرخ لیس لگی ہوئی تھی اور سفید ربن پرو دیا گیا تھا۔ وہ اس نے دھوبی کا گٹھر باندھ کر غلطی سے اوپر رکھ دی تھی اور شاید رخسانہ کی ریشمی کی نئی شلوار تھی اور رامی کا ململ کا دوپٹہ تھا یوں اس نے گھر کا بہترین جوڑا اس کی نذر کرنے کے بعد باقی کپڑے وہاں کھڑے کھڑے سب کو بانٹ دیئے تھے۔ اس میں سلمان بھیل کے آدم جی لالہ کے کناؤ دار کرتے بھی تھے جو انھوں

نے اس سال بڑے چاؤ سے بنوائے تھے۔ زاہدو پرہیزگار ممانی کا نیا غرارہ بھی تھا، ابا کے رومال بھی تھے۔ پلنگ کی سفید چادریں بھی تھیں لڑکیوں کی ڈھیروں شلواریں بھی تھیں، اسکے اپنے کپڑے، خیر بہت کچھ تھا اب اس کا جھگڑا کیا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ اسے صرف ایک جوڑا ملا۔ مگر وہ قمیص دیکھ کر کتنی ہی لڑکیوں کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ تہمینہ بیچاری نے بھی تو شائد دو چار دفعہ ہی پہنی تھی۔

اور پھر سرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن دھوبی آن پہونچا اور مزے سے نانی کے تخت سے کمر ٹکا کر پیر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"لاؤ کپڑے دے دو۔"

"ارے اب کی دھلائی کہاں ہے۔؟"

"کیسی دھلائی، دے نہیں گیا تھا پچھلے منگل کو۔"

"ارے پچھلے منگل کی بات ہو رہی ہے یا اس منگل کی، اب کے کپڑے کہاں ہیں؟"

"لو جی لو اور سنو۔ . . . . میں لے کہاں گیا تھا۔ تم سے کہہ کر گیا تھا۔ ابھی آرہا ہوں، پھر جو ادھر تک پہونچا۔ ایسی بارش ایسی بارش کہ بس تو ادھر ہی سے گھر کو لپک گیا اپنے۔"

"ارے گھاس کھا گیا ہے۔ وہ گٹھر اٹھا کر نہیں لے گیا تھا اب ادھر زینے میں رکھا تھا۔" سلمان کو اپنے کرتا و ازار کرتوں کا بے چینی سے انتظار تھا۔

"قسم لے لو، ایمان سے میں تو ادھر آیا بھی نہیں لوٹ کے

آج آیا ہوں۔"

سب نے اپنے سر پیٹ لیے اور باری باری ایک ایک کپڑے کا ماتم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ نانی کے پرانے غرارے سے بنائے گئے اپنے نئے کمربندوں کا ذکر بھی نہ چھوڑا۔ اجمل نے خیال میں یہ ماتم قطعی بے موقع تھا۔ کپڑوں کا سوتم تو گذر ہی چکا تھا اور دسویں میں ابھی کئی دن باقی تھے۔

"ارے تو پھر گٹھر کون لے گیا۔۔؟"

"لے گیا ہوگا کوئی چور، اٹھائی گیرا۔"

"ارے وہی کم بخت عورت لے گئی ہو گی، یاد نہیں اس دن آئی تھی، کہہ رہی تھی بارش میں گھر کی چھت اڑ گئی ہے کچھ پیسے دیدو۔ میں نے اسی دن نہیں کہا تھا کہ اب تو سب کو مانگنے کا بہانہ مل گیا ـــــ صفا چوٹی لگ رہی تھی صورت سے۔"

"ہاں ہاں ضرور وہی لے گئی یا تو جوتی لے کر بھی نہیں سرک رہی تھی یا ذرا دیر میں ایسی گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"ارے ان کم بختوں کو نہ پیسہ چاہئے نہ دھیلا۔ یہ تو مردوں کو تلکنے آتی ہیں مردوں کو۔" ممانی اپنے میاں کی طرف سے خاصی بدظن تھیں۔

"ہائے میری قمیص!"

"ہائے میری نئی شلوار!"

"اور میرے نئے کرتے کٹاؤ دار کام کے۔"

صرف وہ ایک تھا جو خاموشی سے کاغذ پر قلم گھستا رہا۔ اس نے گھر کے ہائے واویلا میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ تب بھی اس پر کسی کو شبہ نہیں

ہوا۔ اس کی عادت ہی ایسی تھی۔ اب یہی دیکھو لو بارش میں جب سارے گھر کا برا حال تھا وہی تھا جو جلے پاؤں کی بلی بنا اندر باہر گھومتا رہتا تھا بچپن میں چار سال ہاسٹل میں گذار دیتے تھے کہ وہ گھر بھر سے نرالا نکل گیا تھا۔ اور اب پھر رہا تھا کنسٹرکشن انجنیر بننے کو کہ سال میں کئی کئی مہینے سمندروں کے تھپیڑے کھاتا پھرے۔ کیا ایک ایک نے اسے سمجھایا اور ڈرایا تھا مگر اس کی تو ہر بات ہی نرالی تھی۔ ایسے میں اس بات کا کیا وہم ہوتا کہ وہ اپنی سفید قمیضوں اور پتلونوں کو نہیں رو رہا۔

ادھر ادھر سے سمیٹ سمٹا کر دھوبی کو کپڑے دیئے گئے۔

ممانی پان لگاتے ہوئے بولیں۔

"اے جی دھوبی! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ منگل کے دن کپڑے لانے اور لے جانے کا چکر چھوڑ دو۔ لو جی بیٹھے بیٹھے ہی چالیس پچاس کپڑوں کی چپت پڑ گئی۔"

"پھر کتنے دن لایا کروں ——؟"

"جمعے کے جمعے۔"

"نہ، جمعے کو اپنے ہزار کام ہووے ہیں۔"

"تو کسی اور دن سہی۔"

"اچھا جمعرات کو لایا کروں گا۔ آئندہ سے۔ سلام علیکم۔"

دھوبی اپنا گٹھڑ باندھ کر چلا گیا۔ اور گھر میں کپڑوں کا ماتم ہو رہا ہے۔ اجمل نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور باہر چلنے پر کمر باندھی۔ اسی وقت ریڈیو نے پھر بارش کا اعلان کیا۔ کپڑوں کو بھول کر سب جان کی فکر میں

میں لگ گئے۔

اسکول کالج کھلنے کا اعلان کر دیا گیا۔ آسمان ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر بدستور پانی تھا۔ لڑکیوں نے پہلے کوٹھے پر چڑھ کر آسمان کے بادلوں سے صلاح ومشورہ کیا۔ پھر بہزار دقت گھر سے نکلیں۔ نہمینہ سب میں ڈرپوک تھی۔ اور سلمان بھیا کی لاڈلی بھی وہ اسے کالج چھوڑنے اور لانے پر تیار ہو گئے۔ شام کو جب وہ واپس آئی تو اس پر عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ سلمان بھیا سے کہہ رہی تھی۔

"بھیا آپ نے منع کر دیا۔ ورنہ میں تو سچ مچ اتر وا کر دم لیتی۔"

"جاؤ جانے دو اب وہ تمہارے کس کام کی تھی۔"

"قصہ کیا ہے؟"

"ارے کمال ہوا، ابھی راستے میں وہ جو نئے مکان بن رہے ہیں نا۔ اس کے پاس ایک لڑکی میری لیس والی قمیض پہنے کھڑی تھی۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ وہ تمہاری ہی تھی۔"

"لو ہم اپنی قمیض نہیں پہچانتی۔ اپنی سلائی، سرخ لیس سفید رِبن وہی گلا اور پیچھے جا کر میں نے اپنا ٹانکا رپ ٹک پہچان لی۔"

"اچھا پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"پھر کیا ہوتا میں نے اس کے گال پر ایک تھپڑ جڑا اور پوچھا چڑیل تو نے یہ قمیض کہاں سے لی۔؟"

اجمل کا دل دفعتاً ڈوبا۔۔۔۔۔۔۔ اس کا ہاتھ بے اختیار

اپنے گال تک گیا۔ اور وہ زخمی چڑیا کی طرح منہ کھولے تہمینہ کی بات سننے لگا۔

"لڑکی تو کچھ نہیں بولی۔ وہاں سب کائیں کائیں کرنے لگے کہ یہ قمیض تو اسے امدادی کپڑوں میں ملی ہے، میں نے کہا ہرگز نہیں میری یہ قمیض چوری ہوئی ہے اور میں اسے اتروا کر دم لوں گی۔ وہ لڑکی تو اتارنے کو تیار تھی مگر بھیا کہنے لگے رہنے دو میں تمہیں دوسری بنوادوں گا۔"

اجمل کا دل چاہا اٹھ کر سلمان کا ہاتھ چوم لے ــــ بھیا تم سچ مچ عظیم ہو میں نے تو آج تک تمہیں پہچانا ہی نہیں تھا۔

"اور امی مجھے شک ہے کہ آپ کی ہری قمیض وہاں ایک بڑھیا پہنے بیٹھی تھی۔ مگر میں نے غور سے نہیں دیکھا ہے۔"

یا خدا۔۔۔۔۔۔ جو وہاں کوئی کہہ دیتا کہ یہ گٹھر تو ایک صاحبزادے باندھ کر لائے تھے جو کپڑے اپنے دست خاص سے بانٹ کر گئے تھے تو۔۔ مگر تہمینہ کی بچی کیا سچ مچ تو نے اس کے گال پر تھپڑ مارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پاداش میں تیرے ہاتھ توڑ دوں یا۔۔۔۔۔۔ انھیں چوم لوں کہ انھوں نے۔۔۔۔۔۔ ان گالوں کو چھوا ہے۔"

"بھیا پھر مجھے ویسی ہی قمیض بنوادیں گے نا ــ؟"

"ہاں ہاں ــ" سلمان نے اپنا بڑا سا بٹوہ نکالا اور دس کا ایک نوٹ نکال کر تہمینہ کی طرف پھینکا۔ آج تک اجمل نے سلمان کو ایسی فراخدلی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وعدے تو بہت ہوتے تھے مگر یوں فوراً کے فوراً ان کو نباہ دینا آج ہی کا کرشمہ تھا۔ سچ ہے بارش نے ہر ایک کا دل گداز کر دیا ہے۔ مبارک یہ بارش لیے لوگوں کے ئے۔

دس روپے کے نوٹ نے دفعتہً تہمینہ کے دل کو بھی گداز کر دیا وہ بولی۔ "ارے زرینہ وہ لڑکی اتنی خوبصورت تھی اتنی کہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"کون لڑکی — ؟"

"ارے بھئی وہی جس کا ذکر ہو رہا ہے جس نے میری قمیض پہن رکھی تھی۔ کتنی پیاری تھی۔ ہے نا بھائی جان —— ؟"

"ہونہہ........ میں نے غور نہیں کیا۔"

"لو یہ بھی کوئی غور کرنے کی بات ہے۔ میں کیا اتنی دیر اسکی صورت پر غور کرتی رہی..... جب میں نے اس کے ہاتھ پر جڑا اور اس نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو پتہ ہے میرا دل چاہا......"

اس نے زرینہ کے کان میں کچھ کہا۔ اور دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"سچ مچ اگر وہ اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو پتہ نہیں میں اسے کتنا مارتی قمیض لاتی بھی نا تو وہیں چیر چیر کر دیتی مگر......"

"کون خوبصورت کس کا ذکر ہو رہا ہے —— ؟" ابا سمجھے شاید شادی کے لئے کوئی نئی آسامی زیر غور ہے۔"

"ابا، تھی ایک لڑکی اس کا ذکر کر رہے ہیں۔"

"ہو گی کوئی کالی کلوٹی۔ تم لوگوں کو تو کالی لڑکیاں ہی خوبصورت نظر آتی ہیں۔"

"نہیں ابا وہ تو ایسی گوری ہے جیسے چاند۔"

"تو پھر دیر کا ہے کی ہے۔" لڑکیاں حسب عادت ایک ساتھ

کھلکھلاتیں۔

"تو اب اس کو بھی بناؤ جس کو ایک چانٹا جڑ کر آرہی ہو۔"

"ہے کون بھئی وہ ۔؟"

"ابا وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بارش سے پناہ لینے کے لئے نئے مکانوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بیچاری کی جھگی بہہ گئی ہے۔"

"ارے ۔" ابا فوراً ہی وہاں سے جھٹک گئے۔

"ہاں بھئی رنگ روپ تو آج کل جھگی والیوں میں رہ گیا ہے۔" ممانی گویا ہوتیں۔ "بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی طرح پڑھ پڑھ کر وہ خود کو جلائے نہیں ڈالتیں۔ نہ دھوپوں میں پھرتی ہیں۔"

"یوں کہو ان ہرڈنگیوں کی طرح کھلے منہ نہیں پھرتیں۔ برقع بھی تو اب جھگیوں ہی میں رہ گیا ہے۔"

"ہاں سچ تو ہے دھوپ نہیں لگتی برقع سے۔"

"دھوپ کی بات نہیں دلہن۔ غیر مردوں کی نگاہیں نہیں پڑتیں جن کواریوں کے چہرے پہ غیر مردوں کی نگاہیں پڑیں گی ان کی صورت پر پھٹکار تو آپ ہی برسے گی۔ ارے سارا رنگ روپ ان کی نظریں لے اڑتے ہیں۔ اسی لئے تو ہمارے زمانے میں لڑکیوں کو غیر عورتوں سے بھی بچاتیں تھے۔ ہمارے ہاں جہاں کوئی غیر عورت گھر میں گھسی اماں نے آنکھ سے اشارہ کیا اور ہم لڑکیاں اٹھ کر اندر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے تب ہی تو یہ حال تھا۔ اب کیا کہوں لڑکیوں کے سامنے" نانی پنکھیا منہ کے آگے کر کے باقاعدہ شرمائیں "تمہارے نانا اللہ بخشے بیروں کو نظر لگائیں تھے۔ بیروں کو، منہ کا ذکر نہیں

اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے بیرڑں پر آجکل کی لڑکیوں کے چہروں سے زیادہ روپ تھا۔ ...... سچ آجکل کی لڑکیوں کو دیکھوں تو دل پر بکہ سایہ سے ہے۔ اڑدنگی ہوائی دیدہ ..... جو کوئی مجھ سے پوچھے تو میری نظر میں یہ سارے گھرانے جن کو تم شریف کہو رنڈی خانے ہیں "رنڈی خانے"۔ نانی جب بولنے پر آتی تھیں تو بولے ہی چلی جاتی تھیں لانگ پلیئنگ ریکارڈ کی طرح۔ اور ایسے وقت ہوتا کیا تھا کہ لڑکیاں سب فوراً اتری بری ہو جاتی تھیں۔ مگر جب نانی کو ایک دفعہ اپنا ماضی یاد آجاتا تھا تو اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں جو کوئی پاس کھڑا ہوتا بس اسی کی شامت آجاتی۔ اس وقت اتفاق سے اجمل نزدیک کھڑا تھا۔ "اے بیٹے کلجگ ہے کلجگ ..... یہ کپڑے دیکھو، یہ ٹھسہ دیکھو۔ بن سنور کر مردوں کو سنگھار دکھاتی پھرتی ہیں ..... میں نے بھیا شادی کے بعد پہلی مرتبہ آئینے میں منہ دیکھا۔ ورنہ ہم جانتے ہی نہیں تھے کہ آئینہ کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ نہیں کہ گھر میں آئینہ نہیں تھا، ہاں ایسے آئینے بھی نہیں تھے کہ موئے ایک ایک میز میں تین تین۔ یہ بڑے بڑے جڑے ہیں اور کنواری لڑکیاں ہیں کہ ساڑی باندھنے ہر تے مار لٹک لٹک کے آگے پیچھے دیکھ رہی ہیں .... ہاں ایک چھوٹا سا فریم میں جڑا ہوا آئینہ طاق میں رکھا تھا مگر کبھی اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی کہ اماں نے دیکھ لیا تو ..... گھر سے باہر جانے کا تو خیر سوال ہی کیا تھا۔ سات سال کی تھی جب سے باقاعدہ پردہ شروع ہوا تھا" اجمل نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ واقعی سات سال کی عمر میں باقاعدہ پردے

کی بات آج کتنی مضحکہ خیز تھی اور شادیوں کے بھی یہ طریقے نہیں تھے جیسے
تمہارے اور تمہارے بھائی کے لئے گھر گھر پھر کر لڑکیاں تلاش ہو رہی ہیں۔
نائنیں بات ڈالتی تھیں، پھر گھر والے آتے لڑکیاں دکھانے دکھاتے کا سوال
ہی نہیں تھا۔ بس زبان سے کہا بات پکی ہو گئی۔ سات سات سال تک نہ آنا
نہ جانا، نہ لینا نہ دینا، مگر کیا مجال جو کسی کے دل میں تک بھی ہو یہ شادی
نہیں ہو گی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ پٹاپٹ منگنی اور نکاح ٹوٹ رہے ہیں
اور کبھی نہ یہ دکھاوے تھے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھروں ......
میں سادہ شادیاں ہوتی تھیں۔ میری شادی میں خدا تمہارا بھلا کرے نو جوڑے
چھ بیس چھوٹے بڑے تانبے کے برتن، ایک پلنگ اور ایک بستر ہاں البتہ
زیور زیادہ تھا۔ ایک گلے کا ہار اور ...." اجمل نانی کی یادداشت کو
تو ضرور سراہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور ساری باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں
جہیز کی فہرستیں اسے ہمیشہ بور کرتی تھیں۔ زیوروں کا نام سنتے ہی اس نے گھبرا کر
پہلو بدلا اور کہا۔ "ابھی آیا نانی اماں" پھر وہ کہاں اور نانی کہاں باقی ماندہ
داستان بیچاری ببکھیا کو سننی پڑی۔

توبہ آج تو نے اس کے گال پر تھپڑ مارا ..... اس بات
کے لئے تیرا یہ بھیا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اجمل نے تکیے پر لیٹ کر چھت
کو تکتے ہوئے سوچا...... ایک قہقہہ نزدیک سے ابھرا۔ اجمل نے پلٹ کر
دیکھا۔ سلمان کھڑا ہنس رہا تھا۔" ان عورتوں کے فلسفے پڑھتی نہیں اس لئے
گوری ہیں۔ ...... اب اسی لڑکی نے جس کا ذکر ہو رہا تھا اس سال نویں
کا امتحان دیا ہے۔ ...... تعجب ہے آج کل کیسے کیسے غریب لوگ اپنے بچوں

کو پڑھا رہے ہیں ۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ اس نے نویں کا امتحان دیا ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا اس سے۔ تہمینہ بیگم تو عورتوں سے لڑتی رہیں اور
میں اس سے باتیں کرتا رہا .... یار ایک نمبر چیز ہے۔"

"مگر ...... مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ نے غور سے نہیں
دیکھا ہے۔"

"ارے یار گھر کی لڑکیوں کے سامنے یونہی باتیں کرنی چاہئیں خصوصاً
جب بزرگ بھی موجود ہوں .... یاد رکھو یہ گُر نمبر پندرہ ہے جتنے گر میں
بتا رہا ہوں سب یاد کرتے جا رہے ہو نا، کام آئیں گے۔" سلمان نے حسب
عادت سیٹی بجائی۔ قدآدم آئینے کے سامنے اپنی ٹانگیں فاختہ کے پروں کی
طرح پھڑ پھڑائیں۔ دو تین چٹکیاں بجائیں اور غسل خانے سے باہر نکل گیا۔

اسکول کالج برائے نام کھل کر پھر بند ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر بدستور
پانی تھا۔ اسکولوں میں پناہ گزیں موجود تھے اور بارش بدستور ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی
صرف سانس لینے کو رک جاتی تھی۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر سیاہ بادلوں کے
ٹھٹ کے ٹھٹ چلے آرہے تھے جیسے نمازی عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ کی طرف
بھاگے جا رہے ہوں۔ آج کئی دن بعد پتنگوں کی بہار لوٹ کر آئی تھی۔ گھٹاؤں
کے پس منظر میں رنگ برنگی پتنگیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ سرخ اودی، نیلی
پیلی اور جو دو رنگی تھیں وہ ہر یا چندری کی طرح اور بھی بہار دے رہی تھیں
پیچ پڑ رہے تھے۔ پتنگیں کٹ کر ہوا کے دوش پر تیرتی چلی جا رہی تھیں۔

لڑکے بالے ان کو لپکنے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ کچھ بالکن نے کوٹھے پر سے ان کے گذرنے کے منتظر تھے۔ کبھی زمین پر بھاگنے والوں میں سے کسی کے ہاتھ لگ جاتی کبھی کوٹھے پر سے کوئی لپک لیتا۔ کوئی پتنگ بازی کے انٹرنیشنل قانون کی خلاف ورزی کرتا تو فوراً دہائی پڑ جاتی۔ پتنگ کٹی نہیں ہے لوٹی ہے۔ واپس کرو اور لوٹنے والے کو پتنگ واپس کرنی پڑتی۔ اتنے دن کی بارش کے بعد اس گہما گہمی میں اجمل بھی خود کو بڑا جونیالی سا محسوس کر رہا تھا۔ چھت پر چڑھ کر وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ پتنگ اڑانے لگا۔ تہمینہ اور باجی رخسانہ بھی آگئیں پھر جمیلہ اور رحیلہ آگئیں۔ اور پھر تو سب آتے ہی چلے گئے۔ کوٹھا بھر گیا۔ ننھے بچے دوسری عمارت کے لئے لائی گئی گیلی بجری سے گھروندے بنانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ لڑکیاں پتنگوں کے پیچ پڑتے اور کٹتے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتی رہیں۔ شور شرابا سن کر پاس پڑوس کے رشتہ دار بھی آگئے۔ یہاں تک کہ شمسہ آپا بھی آگئیں۔ آج اس نے شمسہ آپا کی موجودگی کو بھی اتنا محسوس نہیں کیا۔ ہوا کے دوش پر ان رنگ برنگے تتلی جیسی پتنگوں کو اڑتا دیکھ کر یکایک اس کا دل بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ ؟؟؟

امی چھجے پر جھکی نیچے دیکھ رہی تھیں۔ پتنگ کی ڈور کسی بچے کو تھما کر وہ ان کے پاس چلا گیا۔

" امی ہمارا ایک سرونٹ کوارٹر خالی پڑا ہے نا ؟"

" ہاں، کیوں ؟ "

" وہ بیچاری ایک بڑی بی ہیں۔ .... ان کا گھر بارش میں... "

" ایک بڑی بی کیا..... ہزاروں کے گھر گر گئے ہوں گے۔ "

"ہاں مگر........ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں۔"

"کوئی کام ذام کر سکتی ہیں گھر کا۔؟"

"ہاں کیوں نہیں، کر ہی دیں گی کچھ نہ کچھ۔ کپڑے بہت اچھے سیتی ہیں۔ آج کل بھی جب سب خالی بیٹھے ہیں وہ ہی آس پاس کے گھروں سے کپڑے لا کر سی رہی ہیں۔"

"اچھا، اور تو کوئی نہیں ساتھ۔"

"نہ ایک لڑکی ہے چودہ پندرہ سال کی۔"

"نہ بھیا توبہ میری، میں جوان چھوکریوں کو گھر ہی نہیں رکھتی، اپنے ہی گھر کی ماشاءاللہ نہیں سنبھلتیں...... ہاں سچ یاد آیا، میرے کمرے کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے وہ ذرا بدل دینا۔"

"بہت اچھا" اس نے سر جھکا کر کہا اور جھٹ پٹ سیڑھیاں اتر گیا۔ ابھی ابھی اس کے دل میں جو لطافت سی پیدا ہوئی تھی اور وہ رنگین پتنگ کی طرح اوپر ہی اوپر اُڑنا شروع ہوا تھا۔ دھم سے بیٹھ گیا۔ جیسے تیز ہوا سے نازک پتنگ کے پرخچے اڑ گئے ہوں اور وہ یک بارگی نیچے آن گری ہو۔

"ارے کہاں چلے گئے سب ؟" نانی نے جہاں گھر کی چہل پہل میں کمی دیکھی اور گھبرا گئیں۔

"اوپر چلے گئے ہیں نانی اماں—" نانی کو تلے دانی ٹٹولتے دیکھ کر وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوا— "نانی اماں...... وہ ...... جو لوگ بارش سے بے گھر ہو گئے ہیں نا...... ان کی مدد کے لئے کچھ دید یجئے۔"

"اے واہ اپنی اماں سے لو میرے پاس کیا رکھا ہے۔" نانی نے

بغیر سرمے دانی نکالے جلدی جلدی تلے دانی لپیٹ دی۔ بلا سے اس وقت سرمہ نہ لگا ئیں گی۔ مگر ایسا نہ ہو یہ اچکا ان کی تلے دانی میں سے کچھ اچک لے جائے۔ ہاں نہیں تو ۔۔ وقت بے وقت کے لئے رکھے ہیں۔ ان کی کون سی کمائی آ رہی ہے۔

اپنا سا منھ لے کر کمرے میں آیا تو سلمان بھیا پورے صاحب بہادر بنے کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مار جوتے رگڑے جا رہے تھے۔ اجمل کو ہنسی آ گئی۔ ایسا تو باہر کیچڑ اور پانی ہے۔ بڑی سے بڑی اور اچھی سے اچھی سڑک میں بغارے پڑے ہوئے ہیں۔ بندر روڈ اور میکلوڈ روڈ پانی میں ڈوبی کھڑی ہیں۔ الفی کی نیشن ایبی دو کانوں تک میں پانی چلا گیا ہے۔ گیلی سڑکیں ٹریفک کی یلغار سے ادھڑی پڑی ہیں۔ اور آپ ہیں کہ جوتے چمکا رہے ہیں جیسے ان کے لئے سڑکوں پر بانات بچھے ہوں۔

"کہاں جا رہے ہیں بھیا۔۔۔؟"

"یار کئی دن سے نکلا نہیں۔ ذرا کمر سیدھی کرنے جا رہا ہوں۔"

"واقعی کئی دن سے لیٹے لیٹے آپ کی کمر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ کار میں بیٹھ کر سیدھی ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔ سلمان کئی دن سے چھٹی پر تھا۔ قصر امین سے کام پر صرف وہی لوگ جا رہے تھے جنھیں دفتر سے لمبی اور اونچی گاڑیاں لینے آتی تھیں۔ سلمان نے جھک کر سوٹ کیس میں سے اپنا بٹوہ نکالا۔ جو کسی پیٹ والی کی طرح پھولا ہوا تھا۔"

"بھیا"

"ہونہہ۔"

"وہ .... ہم کچھ لڑکے بارش زدہ لوگوں کے لئے پیسے جمع کر رہے ہیں۔ اگر آپ بھی کچھ دیدیں۔"

"ارے یار چھوڑو ان چکروں میں کیا رکھا ہے۔ کرنے والے بہت کر رہے ہیں۔ تم کیا کروگے۔ بٹوہ جیب میں ہی رہ گیا۔

"کچھ کپڑے ہی اگر فالتو ہوں۔"

"کپڑے!" اوبچا یتر۔ خبیث سا قہقہہ بلند ہوا۔ "یار زکوٰۃ تو پہلے ہی نکل گئی۔" احمل کو محسوس ہوا جیسے اس قہقہے میں قہقہے کے ساتھ کچھ اور بھی ہے، کیا اس کے راز کی پردہ دری ؟

"ہاں یاد آیا کچھ یہ پڑے ہیں۔" سلمان نے الماری میں سے چند بے حد سڑے اندے موزے نکال کر احمل کی طرف اچھال دیئے اور سیٹی بجاتا اپنے چھپے راستے یعنی غسل خانہ کی طرف سے باہر نکل گیا۔ احمل کو معلوم تھا کہ وہ جب بھی کسی شریفانہ کام پر روانہ ہوتا صدر دروازے سے جاتا۔ مگر بچپن، دوستوں کے گھر یا دوسری نسنم کی مہموں کے لئے راہ چھپی جاتی۔ موزوں کی سڑاند سے گھبرا کر احمل باہر جا کر صحن میں بیٹھ گیا۔ اوپر سے لڑکیوں کے بے تحاشا ہنسنے کی آواز آرہی تھی شاید وہ خود پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا کہ لوگ کتنے مختلف انداز اور آوازوں میں ہنستے ہیں۔ شمہ آپا کی ہنسی کس قدر ہسٹیرک ہے وہ دانت بھینچ کر اور سر کو پیچھے پھینک پھینک کر یوں ہنستی ہیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور بہت دیر تک رونے رہنے کا ارادہ ہو۔ اور پھر ہنستی بھی کس قدر ہیں اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہ سننے والے کو یا تو ہنسی آنے لگتی ہے یا رونا۔ ان کی اس ہنسی کے پیچھے سنتے ہیں اک کرب بھری زندگی ہے۔

یہ اس کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ تھا کہ شمیمہ آپا کسی پر عاشق ہوئیں اور وہ حضرت کسی اور سے شادی رچا بیٹھے بس انھوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اور ایک عمر کا کنوارپنہ جوگی کے عالم میں کاٹ دیا۔ شمیمہ آپا کا گھرانہ وہ گھرانہ ہے جو خاندان کے ہر شخص پر معترض ہوتا ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ خود ان کی کسی بات پر انگلی اٹھا سکے۔ ماں باپ بہن بھائی سب ایسے پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑتے ہیں کہ وہ اپنے مرنے کی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ پہلے بھی ان کے بارے میں چند افواہیں اڑی تھیں مگر چند سال ادھر تو انھوں نے نوب پر پرزے نکال لئے تھے۔ بازار میں کبھی کسی کے ساتھ کبھی کسی کے ساتھ نظر آنے لگیں تھیں۔ پھر کاریں انھیں گھر سے لینے آنے لگیں اور اب تو یہ بات بھی پرانی ہو گئی تھی اتنی عام کہ ان کے ہاں جانے والا ہر شخص یہ جانتا تھا کہ یہ سب ان کے "کزن" ہیں۔ باہر والوں کو چھوڑ کر اب خاندان والوں سے بھی ان کا تعارف یہی کہہ کر کروایا جانے لگا تھا اور مزا تو اس وقت آتا تھا جب دو "کزنوں" کا تعارف یوں ہوتا تھا۔ "آپ سے ملئے آپ ہمارے کزن ہیں ...... اور آپ ...... آپ بھی ہمارے کزن ہوتے ہیں۔" یہ وہ بولڈ خاتون ہیں کہ جب پہلے پہل خاندان کی کسی بہادر خاتون نے جان پر کھیل کر ان پر آوارگی کا الزام لگایا اور ماں باپ نے ان سے پوچھ گچھ کی تو رو رو کر انھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور کہا کہ اگر ان پر ایسی تہمتیں دھری گئیں تو وہ زہر کھا لیں گی۔ مگر ابھی نہیں ...... نو مہینے بعد تا کہ سب کو یقین ہو جائے کہ وہ ایسی ویسی نہیں تھیں۔ افوہ دنیا میں کیسے ناقابل یقین کردار ہیں!!! مگر

اب یہ کہانی بھی پرانی ہو چکی تھی۔ آج کل ان کی باتوں میں زہر دہر کا بھی کوئی ذکر
نہیں تھا۔ مجسٹریٹ کے کھیت میں ہاتھ ڈال کر اگر کوئی اعتراض کر ہی بیٹھتا تو
وہ بڑے اعتماد سے کہتیں۔ "میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"
اب کون ان سے پوچھتا کہ جو کسی چیز کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں وہ چوروں کو
ساتھ لے کر گھومتے ہیں کیا؟ یا چور ہی چیز کی اچھی حفاظت کر سکتا ہے
ان کے والد کی پنشن ہو چکی تھی۔ بیٹے برسر روزگار تھے مگر مشکل سے
اپنے اپنے گھر کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ ایسے میں یہ بیٹی ہی ماں باپ
کے سر کا سایہ اور کفیل تھیں۔ اور ماں باپ ان کی حرکتوں کو نہایت خندہ
پیشانی اور بردباری سے برداشت کر رہے تھے کیونکہ ایک مرتبہ وہ
ملک چھوڑ کر چلے جانے کا ڈراوا بھی دے چکی تھیں۔ احتیاج بڑوں کو
چھوٹا اور چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے اور اسی لحاظ سے فرماں برداری کے
معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اب شمیمہ آپا تو ماں باپ کو فلاں کام کرنے یا
نہ کرنے پر ٹوک سکتی تھیں مگر وہ اس بات کے مجاز نہیں تھے......

اُف، دنیا میں اس بائیس سال کی عمر میں جسے نانی کچی عمر کہا کرتی تھیں
اس نے کیا کچھ نہ دیکھ ڈالا تھا...... ایک مرتبہ شمیمہ آپا دفعتاً
اس پر بھی بے حد مہربان ہو گئی تھیں۔ انھیں تصویریں کھنچوانے کا بڑا
شوق تھا۔ اکثر اسے ساتھ لے جاتیں۔ اسٹوڈیو میں کبھی کبھی اسے اپنے
ساتھ کھڑے ہونے یا بیٹھنے کا شرف بھی بخشتیں۔ زیادہ موڈ میں ہوتیں تو
کمر میں ہاتھ بھی ڈال لیتیں۔ اور پھر ایسی تصویریں ایسی ہسٹیرک ہنسی
کے ساتھ سب کو دکھاتی جاتیں اور ہنستی جاتیں۔ اپنا بہت سا قیمتی

وقت انھوں نے اپنے پرانے البم اس کے پیچھے کھڑے ہو کر دکھانے اور ہر تصویر کی تفصیل سمجھانے پر صرف کیا تھا۔ پھر وہ اس کے لئے لائبریری سے اچھی اچھی کتابیں بھی لانے لگی تھیں۔ تو اکثر کرنے دونوں ساتھ جاتے تو راستے میں کتاب پر تبصرے بھی ہوتے کہ اچانک ایک دن سلمان نے اس سے کہا۔ "آجی یار . . . . ناشتے میں باسی چیزیں مزا نہیں دیتیں، تازہ کیل ہی اچھے لگتے ہیں۔ رات رات کا کھانا ہو تو دوسری بات ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" سن سے اس کے جسم میں کوئی چیز دوڑی تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں کراچی میں ایک سے ایک اچھا دانہ موجود ہے تو سڑی ہوئی الٹی پر گرنے سے فائدہ؟"

"بھیا قسم لے لو، میں تو . . . . . . حد ہے . . . . . . سچ مچ یقین کرو۔"

"اے بھائی تم تو ابھی بچے ہو اسی لئے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ مجھ پر بھی عنایتوں کی یہ بارش ہو چکی ہے، میں نے کہا بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ . . . . . . دیکھو اصول بنا یہ ہے کہ ایک تو آدمی گو کھاتے نہیں۔ اور اگر کھاتے تو پھر پلیٹ میں سجا کر چھری کانٹے سے کھائے یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا تو ہو . . . . . . "

اف بھیا کیا گندی بات ہے"۔ اس کی جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو اسے سچ مچ ابکائی آگئی ہوتی۔

گندی ہو یا صاف یہ کام کی باتیں ہیں۔ انھیں پلو سے باندھ کر رکھو پلو سے۔" وہ دن اور آج کا دن اجمل شمسہ باجی کے قہقہے صرف دور سے سنتے

کا گناہگار تھا۔

لڑکیاں ابھی تک ہنسے جا رہی تھیں۔ یہ باجی رخسانہ کیسے ہنستی ہیں جیسے کوئی ٹیٹری پکارتی چلی جائے "ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں۔ ٹیٹری ہوں پیاسی ہوں"۔ اور خالو کیسے ہنستے ہیں ہر وقت ہنسنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں مگر کیسی کھسیانی سی ہنسی ہے جیسے ہنسی کی معذرت ہو اور گیبی بجیا دوسروں کی باتوں پر کم ہنستے ہیں اپنی باتوں پر زیادہ اور ہنستے ہوئے ایک ایک کی طرف کیسے فرمائشی انداز میں دیکھتے جاتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں۔ ارے بھئی تم بھی ہنسو نا۔ دیکھو کیا مزیدار بات کہی ہے میں نے۔ اور ماموں آنکھوں کو میچ کر کیسے ہنستے ہیں ہی ہی ہی ہنستے ہی چلے جاتے ہیں۔ واقعی ہنسی کی آوازیں بھی کیسے کیسے غم اجاگر کر دیتی ہیں۔ ابا کیسے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر ہنستے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ہنسی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کو ان کے حضور باقاعدہ درخواست دینی پڑتی ہے اور پاسپورٹ اور ویزا لے کر بے چارہ باہر آتا ہے اور بھیا کے قہقہے بلند و بانگ جیسے پکار پکار کر کہہ رہے ہوں لوگو سنو میں ہنس رہا ہوں، دیکھو میں کتنا زندہ دل ہوں، کیسا خوش مزاج ہوں، کتنا خوش ہوں مگر اندر سے ڈھول کے پول...... لیکن اس کی ہنسی کیسی صاف ستھری،۔ بے لوث ہنسی ہے جیسے مندروں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں، جیسے...... جیسے صاف شفاف بلوریں برتنوں کے ٹکرانے کا ترنم۔ اس ہنسی میں نہ کوئی غم چھپا ہوا ہے، نہ کسک ہے نہ بناوٹ ہے نہ دکھاوا۔ کچھ لوگ اتنے معصوم ہوتے ہیں، کیوں اتنے پیارے ہوتے ہیں اور پھر سب لوگ ایسے کیوں نہیں ہوتے...... آج کتنی معصومیت سے اس نے کہا تھا۔ "بس آپ دن

میں ایک مرتبہ یہاں آیا کریں ۔"

"کیوں ؟"

"بس ......" کہہ کر وہ ہنسی تھی اور پھر اس نے کہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہے لوگوں کو ..... باتیں بناتے ہیں کہ .....؟" اس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔

"کہ یہ چھوکرا نہ جانے کس کے چکر میں یہاں آتا ہے ۔ ہے نا۔"

پھر وہی صاف شفاف بلوریں ہنسی ۔

"ہاں بھئی لوگ اچھی باتوں میں بھی بُرے پہلو نکال لیتے ہیں ، ٹھیک ہے آج سے میں دن میں ایک دفعہ آیا کروں گا۔ جس وقت تم کہو۔"

"جب آپ کا دل چاہے۔"

"اور اگر میرا دل نہ چاہے ؟"

"تو آپ کی مرضی۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی نہیں تھی بلکہ اس کی لمبی بڑی آنکھوں میں اداسی بکھر گئی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں ۔ "کیا ایسا بھی ہوگا کہ تمہارا دل نہ چاہے"۔

"یہ لو ...... یہ کچھ پیسے ہیں۔ اپنی ماں کو دے دینا"۔ اجمل نے اپنا بٹوہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ جس میں اس کے اس ماہ کے وظیفے کے بچے ہوئے پیسے تھے اور جہنا جی نے اسی ادا سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"آپ کیوں دیتے ہیں ، ہمیں ضرورت ہی نہیں — سلائی سے بھی پیسے آجاتے ہیں۔"

"تمہیں میرے پیسے اچھے نہیں لگے۔۔؟"

"نہیں۔" اس نے گردن کے اشارے سے کہا تھا اور اس وقت بھی اس کی آنکھیں زخمی تھیں جیسے لین دین کے اس تعلق پر رو رہی ہوں۔

"میں سمجھ گیا۔۔۔۔۔۔ اچھا تو کل میں سب کے لئے لاؤں گا تا کہ تمہیں برا نہ لگے۔"

اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اجمل نے سوچا تھا گھر ہی گھر میں پچاس ساٹھ روپے تو ہو ہی جائیں گے۔ مگر یہ اسکیم فیل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ گھر کے سب لوگوں کو آزما لیا تھا۔ نانی، سلمان بھیا اور قومی شعور والے خالو نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ سیاسی شعور والی ممانی نے کتھے میں بھیگا ہوا ایک روپے کا نوٹ نکال کر دیا تھا۔ اور اماں نے بہت بڑ بڑا تو پانچ روپے۔ لڑکیوں نے دو دو چار چار روپے صرف اس کا دل رکھنے کے لئے دیئے تھے۔ باجی رخسانہ اور تہمینہ سگی بہن ہونے کے ناطے ایسے وقت بھی اڑ گئی تھیں اور ابا سے مانگنے کی تو اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اور کہیں بال کی کھال نکالنا شروع کر دیں۔ وہ اندر آیا۔ الماریوں میں پرانے اخبار اور کتابیں ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے ہنسی آئی۔ واہ میاں اجمل جہاں تجارت میں ہزاروں نہیں کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا ہو۔ بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں وہاں تمہاری ردی کا سودا کرنے کون بیٹھا ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کسی سے قرض لیا جائے مگر دوست تو ایک سرے سے سب نکمے اور حرام خور ہیں۔ ایاز قدر آتا ہے تو کیسی منمنیا شکل بنا کر آ جاتے ہیں مگر جب وہ کوئی چیز مانگتا ہے تو ایک سے ایک چھٹا ہوا بہانہ تیار رہتا ہے۔ کتاب ہے تو پہلے ہی کوئی مانگ کر لے

گیا، اسکوٹر ہے تو خراب پڑا ہے، سائیکل ہے تو پنکچر ہے، کیسے فضول دوست
ہیں سب اس کے۔ کیوں نہ بارش کے بعد وہ اپنے دوستوں کو بھی اور رہا
کر ڈالے۔ ہاں وہ بہار کالونی والا دوست تو پر خلوص ہے مگر بے چارے
کے پاس ہے ہی کیا جو دے اور....... وہ بھی تو....... جب سے اسے
پتہ چلا ہے کہ میرے لئے لڑکیوں کی تلاش ہو رہی ہے، موقع بے موقع اپنی
بہن کو دروازے کے پاس بلاتا رہتا ہے۔ کبھی چائے کی فرمائش کرتا ہے
کبھی شربت کی۔ ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز دیتی ہے تو پردہ ہٹا دیتا ہے۔ کھانے
پر جو مزیدار چیز ہوتی ہے۔ ہمیشہ بہن کے ہاتھ کی ہوتی ہے۔ حالاں کہ وہ
خوب جانتا ہے کہ جب بہن اس سے عمر میں بڑی ہے تو اکمل سے بھی بڑی
ہو گی....... ہائے مگر بے چارے بھائیوں کی مجبوریاں۔ کیوں کسی
کو برا کہا جائے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مجبوری میں مبتلا ہے۔ اور لڑکیوں کی بھی
مجبوریاں ہیں کوئی غریب ہے۔ شادی نہیں ہوتی۔ کوئی ان پڑھ ہے، کوئی کالی
ہے۔ ہر بھائی کے دل پر بہن کا بوجھ ہے۔ کیا خود ان دونوں بھائیوں نے اپنے
دوستوں کی فہرست اس لئے نہیں ٹٹولی ہے کہ شاید ان میں یا ان کے بڑے
بھائیوں میں کوئی ان کی سگی یا خالہ زاد بہنوں کا ہاتھ پکڑنے والا نکل آئے۔
اوہ، یہ شام کتنی لمبی ہو گئی ہے۔ ورنہ وہاں آتے جاتے کس مزے سے
گذر جاتی تھی۔ مگر اب حکم مل گیا ہے۔ دن میں صرف ایک مرتبہ آیا کرو۔ حکم!
کیا اس کی زبان سے حکم بھی نکل سکتا ہے۔ نہیں ایک میٹھی سی درخواست
اور پیاری سی ہنسی۔ اس ہنسی کے لذت آگیں تصور سے زیادہ سے زیادہ
لطف اٹھانے اور شام کا یہ نہ کٹتا ہوا وقت کاٹتے وہ ٹہلنے کے ارادے سے

باہر نکل گیا۔

سڑکوں کا بیچ کا تھوڑا سا حصہ خشک تھا مگر کنارے پانی سے لبالب تھے۔ کہیں کہیں ڈھلان پر ساری سڑک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اسے بچ کر کناروں سے نکلنا پڑا۔ سیٹھی ہلنی کی پھواروں میں گم وہ ایک کھلے مین ہول میں گرنے سے بال بال بچا۔ اور تصور کی دنیا سے نکل کر گرد و پیش کی دنیا میں آپہونچا۔ خشک دنوں میں اس نے دیکھا تھا کہ یہ مین ہول جس میں لوہے کی سیڑھیاں چلی گئی تھیں کنوئیں کی طرح گہرا تھا۔ اب وہ لبالب بھرا ہوا تھا۔ تین آدمی ایک دوسرے کے سر پر کھڑے ہوکر اس میں مزے سے ڈوب سکتے تھے۔ پتلی سی سڑک کے ہر موڑ پر ایک مین ہول اسی طرح کھلا پڑا تھا۔ اور آج کل ان میں سے ہر ایک بذات خود ایک چھوٹا سا سمندر تھا۔ تعجب ہے کہ ان میں کسی بچے کے ڈوب کے مرنے کی اطلاع اب تک نہیں آئی تھی۔ حالاں کہ بچے تو بچے چلتے پھرتے آدمیوں اور اسکوٹروں کا اس میں گر کر غائب ہو جانا بھی بعید از قیاس نہ تھا۔ کے۔ ڈی۔ اے کے دفتر کے احاطے میں اس نے مین ہول کے ڈھکنوں کے پہاڑ کے پہاڑ سجے دیکھے تھے۔ اے کاش کوئی ان ڈھکنوں سے مین ہولوں کو ڈھانک دیتا اور زندگی کے ہزار خطروں میں سے ایک ہی خطرہ نکل جاتا۔ ...... کیا اللہ میاں کے یہاں بھی رزق کے پہاڑیوں ہی سجے ہوں گے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کہیں زندگی دانے دانے کو ترس رہی ہے۔ اس فضول خیال سے لرز کر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور دھیان بٹانے کے لئے منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگا۔

گھٹاؤں نے تو جیسے کراچی کے آسمان کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ کالے بادل شام کی سرخی سے ہولی کھیل رہے تھے۔ سامنے دیوار کی طرح سیدھے چلے گئے پہاڑ کی چوٹی پر چند لوگ شہتیروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ حضرت نوحؑ کے خاص الخاص چیلے ہوں۔ اور انھیں نسل انسانی کی بقا کا کام سونپا گیا ہو۔ پہلے دن جب وہ لڑکیوں کے ساتھ اس پہاڑ کی تسخیر کے لئے نکلا تھا تو کسی نے اعلان کیا تھا کہ اس پر چڑھنا ممکن نہیں کیوں کہ یہ دیوار کی طرح سیدھا ہے۔ اس پر رحیلہ نے پہاڑ کی چوٹی کے لمبے سلسلے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ " اگر یہ ناقابل تسخیر ہے تو وہ لوگ وہاں کیسے پہونچے۔ " تھوڑے سے فاصلے پر وہاں کسی کے کھڑے ہونے کا گمان گذر رہا تھا۔ " ارے یہ تو کھمبے ہیں۔ " سجیلہ نے بڑے یقین سے فرمایا تھا اور تھوڑی دیر بعد جب اس نے سب کی توجہ ادھر کر کے کہا تھا۔ " لو بھئی کھمبے تھک کر آرام کرنے بیٹھ گئے ہیں۔ " تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا تھا۔ سجیلہ کئی دن سے اس سے اس بات پر بھولی رہی تھی۔ کیوں کہ لڑکیوں کے ساتھ مل کر وہ کہتا رہا تھا۔ " ہاں بھئی ٹھیک تو ہے اتنی دور کون دیکھنے جا رہا ہے کہ کھمبے کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں۔ اگر ذرا سستا لیں گے تو کونسی قیامت آ جائے گی۔ " یہ تو طے ہو گیا تھا کہ پہاڑ کی مہم سر ہو سکتی ہے۔ مگر ان لڑکیوں کے ساتھ جتنی مرتبہ بھی گیا۔ پہاڑ پر بھی نہ چڑھا جا سکا۔ ذرا دور پہونچ کر ہی وہ ہائے واویلا ڈال دیتیں۔ کسی کا جوتا نیچے رہ جاتا۔ کسی کی کمر میں چک آ جاتی۔ کوئی چڑھائی کی طرف دیکھ کر ہی نیچے بیٹھ جاتی۔ انھیں نازک مزاج اور ڈرپوک بننے میں جانے کیا مزا آتا ہے۔ اجمل نے تو ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں

جھریوں کے دوش بدوش بوجھ اٹھاتی تھیں۔ ان کے گھر کے آس پاس کتنے ہی نئے مکان بن رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے اب تو کام رک گیا تھا۔ اور نیو بڑے ہوئے مکان کا ہر کمرہ چھلکتے جام کی طرح لبریز تھا۔ مگر خشک دنوں میں اس نے کتنی ہی گھاگھرہ چولی پہنے ہوئے عورتوں کو مٹی ڈھوتے اور سیمنٹ کی تگاریاں لاتے لے جاتے دیکھا تھا۔ ایسے اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ جیسے وہ عورتیں نہیں مرد ہوں۔ خالی وقت میں ساتھ کام کرنے والے مردوں کے پاس بیٹھ کر وہ اسی اطمینان اور خود اعتمادی سے باتیں بھی کرتی تھیں۔ ان عورتوں کے کام کرنے کی بات نئی نہیں تھی پرانی تھی۔ اسے وہ دلچسپ منظر خوب یاد تھا۔ جب وہ بورڈنگ میں رہتا تھا اور کراچی میں چھٹیاں گذار کر واپس جا رہا تھا تو سندھ کے ایک اسٹیشن پر اس نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو کام کرتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرد بارش وضع قطع جس کی پاکستانی کم اور عربی زیادہ تھی تیشے سے پتھر توڑ رہے تھے۔ یہ منظر عجیب اور مضحکہ خیز یوں بھی لگتا تھا کہ ایر کنڈیشنڈ کے بند شیشوں سے پتھر توڑنے کی آواز ذرا بھی نہیں آرہی تھی۔ اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے پتھر مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ ایک ذرا سی مار سے چور چور ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک مرد گارہ تیار کر رہا تھا اور عورتیں تگاریاں بھر بھر کر پلیٹ فارم سے نیچے دوسری طرف ڈالتی جا رہی تھیں۔ یہ عورتیں کم گھیر کی چھینٹ کی شلواریں اور گول دامنوں والی شلوار کی ہم رنگ پھولدار قمیصیں اور کسی دوسرے رنگ کی مگر پھولوں والی چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔ سر ڈھکا ہوا تھا باقی اوڑھنی پیچھے کی طرف پڑی تھی۔ لباس بھی اس کو یاد رہ گیا تھا مگر کبھی نہ بھولنے والی

چیز دراصل ان کا زیور تھی۔ ساری عورتیں ناک کے چھدے ہوئے نتھنوں میں ٹنکتا ہوا چاندی کا زیور پہنے ہوئے تھیں۔ گھر میں عورتوں کو ناک میں لونگیں پہنے تو اس نے دیکھا تھا مگر دونوں نتھنوں کے بیچوں بیچ لٹکتی ہوئی ناک جیسا یہ زیور دیکھ کر اسے بہت ہی ہنسی آئی تھی۔ بعض عورتیں اس بلاق کے علاوہ ناک کے ایک طرف الٹی برابر لونگ بھی پہنے ہوتے تھیں۔ جن میں رنگ برنگے نگ جڑے ہوتے تھے۔ پھر کلائی میں چاندی کے چوڑے بھی بالکل نئی چیز تھے ایک چوڑے نے ساری کلائی کو ڈھانپ لیا تھا۔ اور بعض شوقین مزاج یا "امیر" عورتوں نے اس چوڑے کے دونوں طرف ایک ایک گول کڑا بھی لگا رکھا تھا۔ بعض بعض عورتوں کے بازوؤں پر بھی چاندی کے کڑے چڑھے ہوتے تھے۔ مزدور عورتوں میں زیور کی یہ فراوانی اسے بے حد عجیب لگی تھی مگر ساتھ ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ ان عورتوں میں اپنے لباس یا زیوروں کی طرف سے کسی جھینپ یا خفت کے آثار نہیں تھے، وہ چاروں طرف کے مردوں کی موجودگی اور نگاہوں سے بے نیاز اپنا کام کئے جا رہی تھیں اور ایک یہ لڑکیاں تھیں کہ گھر سے نکلتی ہیں تو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی انھیں دیکھ رہا ہے۔ ویسے کوئی نہ بھی دیکھتا مگر جاتے ہوئی کرنے پر تو دیکھے گا ہی ...... نہیں ان کے ساتھ کوئی پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا، سمندروں پر نہیں جا سکتا۔ اور اسے تو ہمیشہ پہاڑوں پر چڑھنے اور سمندروں کے سینے پہ تیرنے کا شوق تھا...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی دن وہ "اس کو" لے کر ان پہاڑوں اور سمندروں

کے فاصلے طے کرے۔ وہ سخت جان اور ہمت والی ہے۔ اسنے کڑے حالات کے پہاڑ سر کئے ہیں۔ اسنے یتیمی کا دکھ دیکھا ہے، اپنا گھر اُجڑتے دیکھا ہے۔ گھر کی ساری چیزیں نظروں کے سامنے بہتے دیکھی ہیں۔ کپڑے اور کورس کی کتابیں جنھیں دوبارہ وہ آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی چیز اس کی پسندیدہ بھی ہو۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ بے فکری سے ہنس سکتی ہے۔ لوگوں کی نظروں کی زد میں ہونے کے باوجود کم کھانے اور پڑھتے رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر پھولوں کی تازگی ہے۔ اس کی زبان میں پھلوں کے رس ایسی مٹھاس ہے۔ اسنے کبھی اپنی کسی چیز کا ماتم نہیں کیا۔ اور خوددار کتنی ہے کہ کسی بھی چیز کو دیکھ کر انکار میں اس کا سر ہل جاتا ہے اور آنکھوں میں درد کی لہر دوڑ جاتی ہے جیسے وہ سوچ رہی ہو اگر زندگی میں یہ لینا دینا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر زندگی میں یہ لینا دینا ہے۔ کوئی شخص بھی خود کفیل نہیں ہے۔ کوئی شخص بھی خود مختار نہیں ہے۔ آدمی ایک دوسرے سے ہزار قسم کے بندھنوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ کچھ فطری ہیں کچھ خود ساختہ ہیں۔ کچھ دل خوش کن ہیں کچھ روح فرسا ہیں، مگر ہیں۔ اب کیا کیا جائے۔ مہتابی کا اگر کوئی معقول گھر ہوتا، معقول آمدنی ہوتی اس کی امی اور بہنیں اسے دیکھنے جاتیں تو واپس آکر زمین و آسمان کے قلابے ملاتیں۔ اتنی لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد ایک خوبصورت، سادہ مزاج اور ہنس مکھ لڑکی پاکر وہ کتنی خوش ہوتیں مگر اب کیا تھا اس لڑکی میں وہ صرف تہمینہ کے چانٹے کھانے کے لائق تھی۔ کاش کسی طرح وہ

ان کے لئے ایک معقول گھر اور معقول آمدنی کا بندوبست کرسکتا......
مگر کیسے؟ ابھی تو وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوا تھا۔ ابھی تو اس کی آواز کوئی
آواز ہی نہیں بنی تھی۔ ابھی تو گھر میں کوئی اس کی معمولی بات بھی نہیں سنی جاتی
تھی۔ چہ جائیکہ اتنی بڑی بات —— ہاں اگر بھیا کہتے تو شاید اسی بات
میں کچھ وزن ہو جاتا کیوں کہ ان کے بٹوے میں بھی وزن تھا۔ بات اور
بٹوے کے وزن میں بڑا تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اسے کئی دفعہ ہو چکا تھا
جس کے بٹوے میں زیادہ وزن ہو وہ آدمی خواہ مخواہ زیادہ ذہین اور
قابل اعتبار ہو جاتا ہے اور اس کو تو وظیفے کے صرف ستر روپے ملتے
تھے۔ اسی لئے اس کی اکثر باتوں کو مذاق میں اڑا دیا جاتا تھا۔ یا زیادہ
سے زیادہ اسے فلسفی کا خطاب بغیر خلعت کے عنایت ہو جاتا تھا۔ مگر بھیا
ایسی بات کہتے ہی کیوں؟ وہ تو خود کسی بڑے سے محل کے آگے لمبی
چوڑی کار میں بیٹھی ہوئی کسی شہزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔
یہ تو وہ تھا جو بلا وجہ ہی صحیح راہ سے بھٹکا جا رہا تھا۔ سب کا خیال تھا
کہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ نہ جانے اپنے
کام کی کتابیں چھوڑ کر کون کون سی خرافات پڑھتا رہتا ہے۔ یہ اسے
معلوم تھا کہ بہت سی باتیں جو وہ سوچتا رہتا تھا ابھی اس کے لئے قبل
از وقت تھیں مگر یوں تو اس کی شادی کا چرچا بھی قبل از وقت تھا اور
کیوں تھا۔ یہ بھی اسے خوب معلوم تھا۔ امی کہتی تھیں۔ بھیا میں ابھی سے اجمل
کے لئے بھی کوئی لڑکی تلاش کرتی ہوں۔ سلمان کی دفعہ دیر سے شروع کی
تو دیکھو تیس سال کا ہونے کو آگیا ہے مگر لڑکی نہیں ملی۔ وہ تو کہو

لڑکا شریف ہے۔ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر شادیاں جلدی ہی ہونی چاہئیں۔ جب لڑکا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو پھر دیر کا ہے کی۔ خیر سے اپنا اجمل بھی دو سال میں کسی قابل ہو جائے گا۔ لڑکی تیار ہو گی تو جھٹ سے کر ڈالیں گے۔" مگر اجمل کو پتہ تھا کہ اس کے پیچھے سازش کیا ہے۔ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کی۔ یہ جو اس نے سب کی مخالفت کے باوجود مرکنٹائل انجنیئرنگ کا رنگ لگا لیا تھا سمندروں میں پھرنے کا۔ نئی نئی فضاؤں میں اڑنے کا۔ دیس دیس گھومنے کا۔ گھر والوں کے نزدیک اس کا علاج تھا شادی۔ شادی کی بیڑی پاؤں میں ڈال دو۔ صاحبزادے ابھی نئی دنیاؤں کی سیر بھول کر یہیں رہ پڑیں گے۔ بڑ قینچ پر ملے کی طرح۔ شرافت سے کسی فرم میں ملازمت کر لیں گے۔ چھوٹی سی نئی یا بڑی سی پرانی گاڑی لے کر ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔ تو یہ تھا سارا فلسفہ اس عجلت کے پیچھے۔ وہ بھی سب کچھ صبر شکر سے سنے جا رہا تھا۔ حالات دیکھتے ہوئے ابھی دس سال تو سلمان بھیا کے نمٹنے کی امید نہیں تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں اس گھر میں۔ ایک عورت ہی ایسی چیز تھا جس پر سب متفق تھے باقی کسی چیز پر نہیں۔ کوئی ہری چاہتا تھا، کوئی بوٹی، کسی کو سیاہ آنکھیں پسند تھیں۔ کسی کو کنجی، کوئی سادہ حسن چاہتا تھا۔ کوئی اسمارٹ نس، کسی کو لمبے بال چاہئیں تھے کسی کو گھونگھریالے۔ غرض بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جس میں روڑا اٹکانے کو ایک ابا بھی موجود تھے جو ایسا چمکتا رنگ چاہتے تھے کہ سو گز سے اپنی طرف متوجہ کرے۔ اب ایسی لڑکی کہاں مل سکتی تھی۔ سوائے حبشا بچی کے اور وہ قابل غور ہی نہیں تھی۔

واپس آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا اس نے کمرے کی کھڑکی

سے باہر صحن میں دیکھا۔ سفید چنبیلی کے پھول اندھیرے میں چٹکے ہوئے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ ان کی دھیمی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ زرد چنبیلی کے گچھے چوڑے پتوں میں سے منہ نکالے آسمان کے بادلوں کو تک رہے تھے۔ اوپر سے لوگ اتر کر شائد اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو چکے تھے۔ کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ پلیٹیں رکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تو آخر کار یہ شام بھی گذر ہی گئی۔ بغیر وہاں گئے بھی شائد اس نے انتظار کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔
نہ جانے اس وقت کیا کر رہی ہو گی وہاں تو سر شام کھانا کھا لیا جاتا ہے شائد اس وقت سونے کی تیاری ہو گی۔ کھری بان کی چارپائی پہ اسے کیسے نیند آتی ہو گی۔ کسی دن وہ بھی کھری چارپائی پر سو کر دیکھے گا۔۔۔۔۔ کھٹ کھٹ کھٹ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔۔۔۔ کیسے کان بج رہے ہیں، کچھ دن سے اسے کچھ ہو رہا ہے۔ کبھی آہٹ سی ہوتی ہے جیسے کوئی چپکے سے آ رہا ہو کبھی سوتے میں یکایک آنکھ کھل جاتی ہے جیسے کسی نے دھیرے سے پکارا ہو۔ کبھی لگتا ہے جیسے کانوں کے پاس کوئی منہ لاکر ہنس دیا ہو۔۔۔۔۔ کھٹ کھٹ۔۔۔۔۔۔ واقعی کوئی ہے؟ یا در دل پر دستک ہو رہی ہے؟ رات ضرور ہو گئی ہے مگر وہ ابھی سویا تو نہیں ہے۔۔۔۔ کھٹ کھٹ۔ نہیں ضرور کوئی ہے۔ شائد غسل خانے کے دروازے پر۔ غسلخانے کا دروازہ کھول کر اس نے چاروں طرف دیکھا دروازہ بند کرنے والا تھا کہ کسی نے سرگوشی کی۔ "اجی" بڑے بڑے گملوں کی آڑ میں سلمان بیٹھا تھا چھجے کی روشنی سے چھپ کر مگر اجمل نے دیکھ

لیا۔ کہ اس کی پیشانی سے لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دہلیز تھام کر وہ اٹھا
اور جلدی سے اندر آن کر دروازہ بند کر دیا۔

" یہ کیا ہوا بھیّا ——؟"

" ابھی بات سنو..... آج تک میں نے تمہارا راز چھپایا ہے آج
تمہیں میرا راز چھپانا ہے۔"

" میرا راز؟ کون سا راز؟"

" مجھے معلوم ہے دھوبی کا گٹھر کون لے گیا تھا اور کہاں لے گیا تھا
خیر اب میری بات سنو۔ پچھلی دیوار کی طرف درختوں کے جھنڈ میں میری گاڑی
کھڑی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں پولیس کے ڈر سے بھاگ کر آ گیا ہوں
تم یہ کرو......... یہ کرو کہ اس میں جولڑکی بیٹھی ہے اسے ذرا.....
وہ جو نئے مکان بن رہے ہیں نا...... خیر وہ تمہیں خود ہی بتا دے گی۔ تم اسے
چھوڑ کر جلدی سے واپس آؤ اسی غسل خانے کے راستے سے۔ اس وقت تک
میں کسی کو اطلاع نہیں دوں گا۔ اور یہیں رہوں گا........ اور دیکھو اسے
اپنا گھر نہ بتانا ہرگز۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ تم میرے،....... کہ
میں تمہارا بھائی ہوں۔"

" جہانابی ہے اس میں۔؟" کچلے سانپ کی طرح وہ پھنکارا تھا۔

" نہیں اس کا نام شکیلہ ہے۔"

ہاں وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ جہانابی نام خود اس کے ذہن نے
دیا تھا اس کا اصل نام تو شکیلہ تھا۔ غسل خانے کی سیڑھیاں پھلانگ کر پچھلے
دروازے سے وہ یوں نکلا جیسے اب کبھی اس گھر میں واپس نہ آئے گا۔

پچھلے جھنڈیں گاڑی کھڑی تھی۔ ایک طرف سے پچکی ہوئی صاف نظر آرہی تھی ـــ سامنے کی ایک بتی بھی ٹوٹی ہوئی تھی اور ونڈ اسکرین چور چور تھا۔

" مہتابی، شکیلہ ......" دروازہ کھول کر قریب تھا کہ وہ اسے اپنے سینے سے چمٹا لے اور اتنے بوسے لے اتنے بوسے لے کہ زندگی بھر کسی مرد نے کسی عورت کے نہ لئے ہوں. ...... مگر سیٹ خالی تھی پچھلی بھی اور اگلی بھی۔ احتیاطاً اس نے نیچے دیکھا، سڑک پر چاروں طرف دیکھا۔ درخت پر بھی دیکھا مگر مہتابی کہیں نہیں تھی۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور آگے چلا۔ ایک بتی تھی وہ بھی اندھی۔ ٹوٹے ونڈ اسکرین کے پار تارے نا چ رہے تھے اور وہ مہتابی کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا چلا رہا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کتنی دور جا سکتی ہے مگر اتنی گلیوں میں اتنے مکانوں میں وہ اسے کہاں ڈھونڈے۔ عقل سے زیادہ وجدان سے کام لیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کی گلیوں کی بھول بھلیاں دیکھنے کے بعد میں روڈ پر آگیا۔ اس کی منزل وہی مکان تھا جو اس وقت مہتابی کا ٹھکانہ تھا۔ کاروں، بسوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کا ایک سیلاب سڑک پر رواں تھا۔ اس تیز رو قافلے کے درمیان میں گھس جانا بڑا مشکل تھا۔ کسی کو ایک لمحہ کی دیر گوارا نہ تھی۔ اور اسے تو لمحے کے ہزارویں حصے کی بھی نہیں جان کو خطرے میں ڈال کر وہ چلتے ٹریفک کی بھیڑ میں گھس گیا۔ اب بھی اس کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں جیسے ہر چلتی گاڑی میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اس کی سست رفتاری سے الجھ کر لوگ داہنے بائیں سے گذر رہے تھے اور اس پر بگڑتے جا رہے تھے مگر وہ ان کے بگڑے تیوروں سے بے نیاز تھا اسے صرف چلنا ہی تو نہیں تھا کسی کو تلاش کرتے چلنا تھا۔ جہاں جہاں اس کا دل چاہا، جہاں

جہاں اسے شبہ ہوا۔ جہاں جہاں دل نے گواہی دی وہ مڑ گیا اور اسے ڈھونڈتا رہا بالآخر وہ اس کے مکان تک آ پہونچا۔ ذرا فاصلے پر ایک گلی ہیں گاڑی کھڑی کی اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ذرا ہوش میں آ کر جاؤ۔ روزمرہ کی طرح کہیں کچھ اور نہ کہہ بیٹھنا۔ تمہاری اور اس کی عزت کا سوال ہے۔

باری باری اس نے سب کو پوچھا اور سب سے آخر میں اس کی ماں کو۔ وہ بے چارگی مندسی دروازے میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی، اسے دیکھ کر بولی۔ "بیٹا میں بڑی پریشان ہوں۔ شام کو شکیلہ دوکان پر تھا خو لینے گئی تھی ابھی تک لوٹ کے نہیں آئی۔ ...... ہائے میری بچی کو کچھ ہو نہ گیا ہو اتنی دیر میں تو سو دفعہ آجاتی۔ خدا کے لئے اسے ڈھونڈ لاؤ۔"

"اچھا اچھا ابھی جاتا ہوں۔ دوکانوں کی طرف گئی تھی نا؟"

اندھوں کی طرح ٹٹولتا وہ باہر چلا۔ برابر کے کمرے میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔ میں نے خود اسے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے مگر پڑھیا یقین بھی کرے۔"

"آجائے گی پھر تو ...... فکر کی کیا بات ہے"۔ کسی دوسرے نے کہا اور پھر اپنے بے درد قہقہے ابھرے جو اس کے دل کو چیرتے چلے گئے۔

اندھی گاڑی کو لے کر وہ پھر کراچی کی تابناک سڑک پر نکل گیا مگر اب کہاں جائے۔ شاید وہ گھر کے نزدیک ہی کہیں ہو۔ شاید وہ ان کے گھر کے بیشمار بڑے بڑے گملوں کے درمیان کہیں چھپی بیٹھی ہو۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ گھر اس کا ہے ...... اس کا بھی ہے۔ وہ گھر واپس آگیا۔ ایک بار پھر درختوں کے جھنڈ کو اس نے مایوسی سے دیکھا۔ احاطے میں گھسا چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ مگر وہ یہاں نہیں تھی۔ غسل خانے کے بھڑے ہوئے دروازے کو دھکا

دے کر وہ اندر گیا۔ سلمان ابھی تک غسل خانے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گیلی تولیہ اس کے ماتھے پر رکھی تھی جو خون سے گلنار ہو رہی تھی۔

"چھوڑ آئے ؟" وہ بولا۔

"بھیّا یہ تم نے کیا کیا۔ ...... یہ تم نے کیا کیا۔" وہ سسک سے ٹیک لگا کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگا۔ اور پھر چکنی دیوار سے لگ کر پھسلتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں اجّی، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم کیوں اتنی فکر کر رہے ہو۔؟"

غصّے کی ایک بے پناہ لہر اجمل کے ذہن پر نشے کی طرح چڑھتی چلی گئی۔ اگر سلمان کے ماتھے سے خون نہ نکل رہا ہوتا، اگر وہ پہلے سے ہی اتنا مردہ اور زرد رو نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کا گلا دبا دیتا۔ وہ صرف اپنی انگلیوں کو تشنج آمیز بل دے کر رہ گیا۔ اور دانت بھینچ کر بولا۔ بھیّا قسم کھاؤ کہ وہ...... کنواری تھی۔ تمہیں اپنے اس خون کی قسم کہو وہ کنواری تھی۔" سلمان نے اسے حیرت سے دیکھا یہ وہ کیا بک رہا ہے مگر اس کی آنکھوں میں طوفان دیکھ کر اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"ہاں وہ کنواری تھی۔"

"تم نے اسے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ ؟"

"نہیں — وہ جانتی تھی کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ ......

ایک دفعہ میں نے اسے بتایا تھا۔ وہ دو کانوں کے پاس کھڑی تھی میں نے اس سے کہا کہ میں اسے گاڑی میں گھر چھوڑ دوں گا۔ رات کو اس کا

پیدل اتنی دور جانا ٹھیک نہیں۔"

ایک مرتبہ پھر اصیل کا دل چاہا کہ اس شخص کا جو اس کا بھائی تھا گلا دبا دے۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر قطعی غیر مانوس آواز میں بولا۔" صبح اس کے ہاں جاؤں گا۔ اس وقت تک وہ گھر پہونچ گئی ہوگی۔ میں اسے اور اس کی ماں کو یہاں لے آؤں گا اور تمہیں اس سے شادی کرنی ہوگی۔"

"شادی؟ کیا بک رہے ہو۔ دیکھو جلدی سے میرے ماتھے پر پٹی باندھ دو۔ مجھے پلنگ پر لٹا دو اور سب کو بتا دو کہ میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔"

"کیا تم اس سے شادی نہیں کروگے؟"

"نہیں۔"

"باوجود اس کے کہ وہ کنواری تھی۔"

"پاگل ہوگئے ہو، بہت سی لڑکیاں کنواری ہوتی ہیں۔ سب سے شادی نہیں کرنی پڑتی۔ جاؤ جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔"

"اگر تم اس سے شادی نہیں کروگے تو میں کروں گا۔"

"کرلینا ــــ الماری سے دواؤں کا ڈبہ نکال لاؤ مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھو کتنا خون نکل گیا ہے۔" اس نے پیشانی سے تولیہ ہٹائی تو خون ٹپ ٹپ غسلخانے کے فرش پر گرا۔

"مجھے قسم ہے تمہارے اس بہتے ہوکی میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا، میں تمہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔۔۔۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے سے گذر کر اندر کے برآمدے میں چلا گیا۔ وہ پہونچ کر ایسی آواز میں جیسے

برسوں پرانی قبر سے کوئی مردہ بول رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"بھیا کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔" ایک ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ کب کہاں کے جواب میں اس نے صرف کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگ بے تحاشا ادھر لپکے۔ وہ پیچھے سرک گیا۔ پل بھر میں بات پھیلتی چلی گئی۔ نانی چیخنے لگیں۔ لڑکیاں پٹا پٹ گرنے لگیں۔ دوسرے کمرے اور گھروں سے لوگ کیا ہوا کیا ہوا کرتے بھاگے آئے۔ اس افراتفری میں وہ اندرونی زینے سے چھت پر چڑھ گیا اور کسی نے اسے چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

کراچی کی رنگا رنگ روشنیاں اسے یوں نظر آ رہی تھیں جیسے بے شمار شعلے، بے حساب چنگاریاں، آسمان پر بجلی کے لہریئے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ اور اس کے دل کے اندر اور جسم کے اندر کوئی چیز دھڑا دھڑ سوکھی لکڑی کی آگ بنی جل رہی تھی جس میں اس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں خون کھول رہا تھا اور جسم لمحہ بہ لمحہ پگھل رہا تھا۔ فنا ہو رہا تھا۔ کچی عمر کی پہلی پہلی محبت کراچی کی طوفانی بارش کی طرح بے پناہ ہوتی ہے جو اچھا برا کچھ نہیں دیکھتی۔ بس بہائے لے چلی جاتی ہے۔ آدمی اس سے بچ نہیں سکتا۔ بس بہا لیا جاتا ہے۔ بعد میں عمر کی پختگی کے ساتھ جب احساس سود و زیاں بڑھتا ہے تو محبت میں یہ طوفانی کیفیت نہیں رہتی۔ اس وقت انسان اپنی پہلی محبت پر نظر ڈالتا ہے تو اس وارفتگی دجنون پر حیران رہ جاتا ہے یا بچپنا سمجھ کر مسکرا دیتا ہے۔ چاہے پھر بھی یہ عالم پھر نہیں لوٹتا۔ کچی عمر کا عشق زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ ہے اسے دہرایا نہیں جا سکتا۔

ڈریسنگ کے بعد جب ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولی دے دی اور سلمان سو گیا تو سب کو خیال آیا کہ ارے اجمل کہاں گیا۔ اجمل گھر بھر میں کہیں نہیں تھا۔ ہسٹیرک لوگوں پر دوسرا دورہ پڑا۔ قیاس آرائیوں کا ایک طوفان امڈ پڑا شائد وہ ڈاکٹر کو لینے گیا ہو اور اب تک کوئی سواری نہ ملی ہو یا گھبراہٹ میں کسی موٹر کے نیچے آ گیا ہو یا سلمان کے بدلے وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو یا........ یا پتہ نہیں....... لڑکیاں بڑائی بڑائی ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک پھر رہی تھیں۔ امی بے ہوش پڑی تھیں۔ ممانیاں اور خالائیں جا نماز بچھائے بیٹھی تھیں اور وہ ٹھنڈی یخ اینٹ پر سر رکھے گیلی بجری پر لیٹا کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ گیلی بجری آگ کی لپٹوں کی سیج تھی۔ اور اوس سیدھے جہنم سے گرنے والے قطرے تھے ـــــ جو اس کی جلتی روح کو اور جھلسا رہے تھے۔



ششی کملیش

کھلتا سمٹتا نقطہ

اسکوٹر سے اترتے ہی ہڑبڑا کر سنتیا نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ ویسے بھی دو گلیوں کے بعد اس کا گھر تھا۔ پھر بھی پرشانت کا ساتھ آنا، محلے میں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔

مطمئن ہو کر اس نے پرشانت سے رخصت چاہی۔

"پھر کب ملو گی؟"

جلدی میں سنتیا نے کوئی جواب نہیں دیا تو پرشانت نے ہی فیصلہ کیا۔ "کل شام کو اسکول سے لوٹنے پر پک اپ کر لوں گا۔"

"او کے۔" سنتیا نے جلدی جلدی قدم بڑھا دیئے۔ سامنے پان کی دکان پر شاید پرمود تھا۔ چھوٹے بھیا کا دوست، ایک ہی جھلک وہ دیکھ پائی تھی۔ کہیں کچھ کہہ نہ دے جا کر۔ یا اس نے دیکھا ہی نہ ہو — یا وہ ہو ہی نہ۔ ۔ ۔ ۔ اسی الجھن میں وہ گھر کے دروازے تک پہنچ گئی مگر اندر کے شور نے اس کا سر بھنّا دیا — بڑی بھابھی اور منجھلی بھابھی میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

"ڈائن، چڑیل، میرے بچوں کو پھوٹی آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

بڑی بھابھی کی آواز ساتوں آسمان کو چھو رہی تھی۔

منجھلی بھابھی نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ نظر سنتیا پر پڑی۔

"اب پہونچی لاڈو رانی! ساری دنیا اپنے اپنے گھر پہونچ گئی اور یہ ابھی تک باہر ڈول رہی ہیں"

بڑے بھیا کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے نے رینگتے ہوئے آکر دھول سے سنے ہاتھوں سے اس کی ساڑی پکڑ لی۔

"اما لے لئے مالا ئی؟"

سفید ساری کی درگت پر سنتیا کی جھنجھلاہٹ بڑی بھابھی سے نہ چھپ سکی "چل ہٹ پرے...... اور ایک جھٹکے سے اسے گود میں لے کر جھمکتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ باورچی خانے کے پاس والے برآمدے میں چارپائی پر ماں کھانستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"دوا لائی بیٹی؟"

"نہیں ماں فرصت ہی نہیں ملی" جواب تو دے دیا مگر نگاہیں ٹخیل کرتی ہوئی سنتیا جھٹ ماں کی نظروں سے پرے ہٹ گئی۔

پر شانت کی تربیت نے دوا کی بات ہی یاد نہ آنے دی تھی۔ جوانی کا نشہ کیا اتنا تیز ہوتا ہے؟ دل کے گہرے کونے میں سنتیا کو نفریں کرنے لگا۔

کپڑے بدل کر ساڑی جتن سے تہ کر کے اس نے الماری میں
رکھ دی۔ گنتی کی تو اس کے پاس ساڑیاں ہیں مگر ایک ہفتہ میں ہی
ساری ریپیٹ کرتے ہوئے کتنی شرم آتی ہے۔ لیکن کرے بھی تو کیا؟
پرشانت کی دی ہوئی ساڑیاں پہننے پر تو گھر میں کہرام مچ جائے گا۔
پھر پرشانت سے وہ کچھ لے بھی کیوں۔؟ وہ کون لگتا ہے اس کا؟
وہ اس کا کوئی نہیں؟ اور اس کا خوبصورت متین چہرہ اس کی آنکھوں
میں تیر گیا۔ ساتھ ہی دل میں کچھ چبھ گیا۔ اس وقت وہ سامنے نہیں ہے
تو اس کی بیوی اور دو بچوں کی شکل اس کی نظر دل میں گھوم رہی ہے۔
وہ ہوتا ہے تو کہیں کچھ نہیں جھلکتا۔ کہیں کچھ بھی تو نہیں۔

"دیدی"۔۔۔ سدھیر کی آواز اسے خیالوں کے کہرے سے
باہر کھینچ لائی۔ صبح کی اتاری ہوئی ساڑی سنتیا نے جلدی سے بدن
پر ڈالی۔ ویسے بھی کمرے میں اندھیرا تھا۔ "کیا ہے رے؟"

ڈھنگ سے سنوارے گئے بال، کھڑا کالر، بے حد
تنگ مہری کی پینٹ۔ سدھیر کہیں باہر جانے والا تھا شاید۔

"دو روپے تو دینا"

"کیوں؟"

"پکچر جانا ہے۔"

"تجھے شرم نہیں آتی سدھیر، ماں کی دوا کے لئے پیسے نہیں ہیں"
کھسیاکر سدھیر ہنسا۔ ایک بے شرم سی ہنسی، حالات سے
بے پروا۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"میرے پرس میں ہیں لے لے۔"
نیچے سے بابوجی کی آواز آرہی تھی وہ چھوٹے بھیا پر برس رہے تھے۔

"نالائق، آوارہ، شرابی۔"
گالیوں کی بوچھار کو خاموشی سے نشے میں نیم بند آنکھوں سے اوڑھتے ہوئے بھیا...... سنتیا نے کھڑکی کھول دی۔
رات گھر آئی تھی۔ دور جھلملاتی روشنیاں سڑکوں پر تھرکتی، جھومتی زندگی۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سیر سے لوٹتے ہوئے جوڑے۔ اس کی کھڑکی کے نیچے ہلکے اندھیرے میں ایک سلگتے نے دوسرے سائے کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے جھینپ کر منہ پھیر لیا۔
کمرے کے کاٹتے اندھیرے نے پرشانت کے ساتھ گذری سہانی گھڑیوں کی یاد دلائی...... بیرا آکر آرڈر لے گیا تھا۔ جیوک باکس پر اکفیس کی فرمائش بج رہی تھی۔ میز پر ہلکا سا ریشمی اندھیرا تھا۔ پرشانت نے آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ کندھے پر نرم ہاتھ۔ پھر کھینچا اور پھر تن بدن میں آگ لگاتا طویل بوسہ...... سنی سنی... اپنی گونج ہیں آپ کھونا ہے مطلب مگر پیار اتنا طلب!
اور بھی بہت سی یادیں اسے دور کھینچ لے گئیں۔ اس ماحول سے بہت دور جہاں بھابیوں کی آویزش نہیں، طعنے نہیں، ماں کی مجبوری نہیں آوارہ بھائی کے لڑکھڑاتے قدم نہیں۔ جہیز کی کمی کی وجہ سے اب تک بن بیاہی رکھنے کے لئے مجرم چہرہ لئے گھٹے ہوئے بابوجی نہیں۔ اسکولی

بچوں کا شور و غل نہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی جھڑکیوں کے رد عمل میں جھنجھلاتی شخصیت کا احساس نہیں۔ گہری خاموشی، زندگی کی خاموشی میں جب پہلی بار اس نے زندگی کا مزہ پایا تھا۔ کستی باہوں کا کساؤ۔ ایک نشہ جس میں سب کچھ ڈوب گیا تھا۔ اس اچھوتے لطف کو جاننے کے بعد سنتیا کی نظر مینٹل پیس پر رکھی تصویر پر پڑی تھی۔ پرشانت اور اس کی بیوی کی ہنستی ہوئی تصویر۔ حسد کی ایک کسک، یہ نہ ہوتی تو اس لطف اندوزی کی، اس گھر کی وہ تنہا مالک ہوتی۔ پرشانت کی ہم آغوشی کے، مردانگی کے، عیش آگیں لمحے اسے یوں چرانے نہ پڑتے۔ چھی! ایسا نہیں سوچتے، وہ خود سوچتی۔

بڑے بھیا کی آواز پر سنتیا نیچے اتری۔ آٹھ بج رہے تھے۔ پڑوسی کھنہ صاحب کے بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ ٹھنڈی پھیکی چائے کے دو گھونٹ مشکل سے گلے سے اتار کر بچوں کو پڑھانے بیٹھ گئی۔

"بابو کی دال میں گھی پڑا ہے میری میں کیوں نہیں؟" باورچی خانے سے کسی بچے کی آواز یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ سنتیا نے اپنے شاگردوں کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

دس بج گئے تھے۔ سب کھا پی چکے تھے۔ بابوجی آنگن میں چارپائی ڈالے اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ سنتیا نے لائٹ جلانی چاہی مگر رک گئی۔ روشنی میں بابوجی کا چہرہ دکھائی پڑتا۔ افسردہ۔ دکھ اور پریشانی جیسے ان کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھی۔

"آؤ بی بی جی کھانا لگا دوں۔" چھوٹی بھابھی نے آواز دی۔ سنتیا پیڑھے پر بیٹھ گئی۔ "چھوٹے بھیا کھا چکے۔"

چولہے کی روشنی میں چھوٹی بھابی کا لال آنسوؤں سے نہایا چہرہ اور زیادہ لال نظر آرہا تھا۔ سنتیا کا دل ہمدردی سے بھر آیا۔ ماں اور بابو جی نے ایک شرابی کے پلّے باندھ کر بیچاری کی زندگی برباد کردی۔ سنتیا کو کھانا دے کر چھوٹی بھابی بیٹھ گئی۔

"تم کھاؤ نا بھابی؟"

"کھالوں گی۔"

سنتیا اور اصرار نہ کرسکی۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھوکر اٹھ رہی تھی تب چھوٹی بھابی نے کہا۔

"بی بی جی آپ اتنا گھومتی ہیں ہمارے لئے تھوڑا سا زہر لادو اب برداشت نہیں ہوتا۔"

سنتیا کمرے کا کواڑ پکڑے سہم رہ گئی۔ اندھیرے میں ڈوبا آنگن، چارپائی پر بیٹھے بابوجی کے ہاتھ میں سلگتا سگریٹ۔ زندگی بھی اسے جیسے سگریٹ کی طرح پیئے جارہی تھی۔ کھانستی ہوئی ماں بھائیوں کے کمرے کے بند دروازے۔ چولہے میں راکھ ہوتی آگ اور ہاتھوں سے منہ چھپائے روتی ہوئی چھوٹی بھابی اور ہو ہو کرتی خاموشی۔ ....

بچوں کی کاپی کی تصحیح کرنی تھی۔ بدن تھک چلا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی جیسے پریشانی نے اسے باہوں میں سمیٹ لیا۔ ایک بار پھر وہ دوسری دنیا میں کھو گئی۔ سبھوں نے اپنے اپنے سکھ کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرلیا تھا سنتیا بھی تو سکھی ہے۔ کیا وہ سکھی نہیں؟

سکھ ہوتا کیا ہے ؟ . . . .

دروازے پر کھٹکا ہوا۔ کون ہے ؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

" میں ہوں دیدی۔"

" سدھیر! آسو جا، بابو جی نے دیکھا تو نہیں ——" نا سب سوگئے ہیں۔"

ایک گلاس پانی پی کر، لائٹ بجھا کر سنتیا سونے لگی تو اسے خیال آیا . . . . . . کل پرشانت سے ملنا ہے۔ وہ کون سی ساڑی پہنے گی؟ وہی گلابی پرنٹ والی یا نیلی چھوٹے پھولوں والی۔ پرشانت کو یہی پسند ہے . . . . . . مگر پرشانت کی پسند کا خیال میں کیوں رکھوں ؟ . . . . . . اور سنتیا کھلتے سمٹتے نقطہ کی دشوار گذار تنہائی میں کھو گئی . . . . . .



صالحہ عابد حسین

درد کا رشتہ

تو یہ رات بھی بیت گئی۔

وقت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ گذر جاتا ہے۔ فراق کی جان لیوا رات ہو کہ دکھ کی کرب ناک رات۔ جس کا درد کرب دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ہاں خالق کائنات جس پر عقیدہ رکھ کر انسان ہر دکھ جھیل لے جاتا ہے۔

تو یہ رات بیت گئی۔

مگر کیسے؟ یہ کاغذ؟ یہ کہانی؟ کہاں سے آ گئی یہ کہانی —؟ کانٹوں پہ لوٹتے لوٹتے کب اس نے قلم اٹھایا؟ کیا لکھتی رہی؟ اسے کچھ بھی یاد نہ آ رہا تھا۔ ہاں دھندلی پنسل سے لکھے ہوئے کاغذوں کے ٹکڑے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

اس نے منتشر اوراق کو اکٹھا کیا۔ مشکل سے انھیں ترتیب دیا اور پڑھنا شروع کیا۔ نم آنکھیں اور بھیگ گئیں — درد کا پرانا رشتہ۔ اور مضبوط کر گئے۔

مگر تمہارے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے شعلوں کو بجھانے کی حسرت

دل ہی میں رہ گئی۔

تم کہ واحد نشانی رہ گئی ہو اس سنہرے ماضی کی، جس کی یاد ہی اب زندگی کا سہارا ہے۔

تم — جس سے مل کر ماں کی ممتا اور بہنوں کا کھویا ہوا پیار پھر ذرا دیر کو مل جاتا تھا۔

تم — کہ درد و غم کو اپنے پیار سے کم کرنے کا گر جانتی ہو..

...... تم آئیں تو ہم دونوں مل کر ماضی کو حال بناتے، پیاروں کی یادیں تازہ کرتے جن کی یاد کے گھاؤ ناسور بنتے جا رہے ہیں!

تم کہ میری کوئی نہیں......

نہ خون کا رشتہ — نہ ذات برادری کا ناتا۔ نہ طبقہ ایک نہ ذہنی رفاقت، نہ دماغی ہم آہنگی۔

تم کہ..... "اعلیٰ قدروں" کے معنی "تہذیب و تمدن" کا مطلب "علم" کی اہمیت "عشق" کی ہمہ گیری۔ "خودی" کا لفظ تک نہیں جانتیں۔

تم کہ ایک نیچ ذات کی فرد، ان پڑھ، ان کلچرڈ سمجھی جاتی ہو سماج میں۔

تم کہ جس کی محبت کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ ساری نوع انسانی سمٹ سکتی ہے۔

تم کہ ماں کا آدرش روپ ہو — پریم اور سیوا کی مورتی غریب اور کیسی غریب — پھر بھی دیالو اور کیسی دیالو! فیاض اور

کتنی فیاض۔ اپنی محنت مشقت سے پیدا کیا پیسہ اپنوں اور غیروں پڑوسیوں "اپنے پیاروں" پر خرچ کر دیتیں اور سب تمہیں "ساون کا اندھا" کہہ کر مذاق اڑاتے۔

تم ـــ جو پیسہ سے بھی زیادہ خدمت اور محبت کی انمول دولت لٹاتیں۔ اسی طرح جیسے ہوا اور پانی بے دریغ اپنی نعمت دوسروں کو بخشتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

تم ـــ کیسے کیسے ـــ یہ اٹل حقیقت جان گئیں کہ انسان کی تخلیق کا راز انسانیت کی محبت ہے جس کا زندگی بھر یہ مسلک رہا کہ سہ

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

تم ـــ کہ۔ ہم جہاں سے ہر ایک کی مشکل یا مصیبت کے وقت پہونچ جاتیں اور لوگوں کا دکھ بانٹ لیتیں ذمہ داریاں اٹھا لیتیں۔

تم ـــ جس سے لوگ اس پر خفا ہو جاتے کہ سب کو چھوڑ کر تم صرف ان کی کیوں نہیں ہو جاتیں ؟

اور تم ـــ تم ایک محبت کو خفا کر کے دوسری محبت کی طرف دوڑ جاتیں اور پھر اسی غم میں گھلا کرتیں کہ فلاں یا فلاں تم سے ناراض ہے۔ تمہارے لب پر شکوہ نہ آتا مگر خاموش آنسو اسی غم کی غمازی ضرور کر دیتے۔

تم ـــ کہ دست طلب دراز کرنا خودداری کے خلاف جانتی تھیں جو کسی نے دے دیا ـــ ۔۔ انتہائی شکر گذاری سے لے لیا اور بدلے میں پر خلوص دعا، ان کا خزانہ ہو تا تھا۔

تم ۔ ان جانے میں مذہب اور اخلاق کی قدروں کا پالن کرنے والی ۔۔ علم اور تہذیب کا جو حاصل ہزاروں سال میں دنیا نے معلوم کیا ۔ ہاں صرف معلوم کیا ہے اس کو دل میں چھپائے ، انسانیت کی ۔ انسانوں کی ستّر برس کی عمر تک سیوا کرتی ہیں ۔

تم ۔۔ جس نے مجھے پالا ۔۔۔ اور اپنے بچوں سے زیادہ چاہا ۔

تم ۔۔ میری ماں کی پرستار ، میری بہنوں کی فدائی ، میرے بھائیوں کی چاہنے والی ۔۔ میرے بچّوں پر نثار ۔۔۔

تمہاری محبت ۔۔ کس چیز سے تشبیہہ دوں اس محبت کو جو خاص کر تمہیں میرے بھائیوں سے تھی ۔

کتنا چاہتی تھیں تم ان کو ، اپنے بھائیوں سے زیادہ ، اپنے بیٹوں سے زیادہ ۔

یہ وہ محبت تھی جس میں بناوٹ نہیں ہوتی ، گہری خاموش محبت ، دل سوز الفت جو صرف ایک بہن کا حصہ ہوتی ہے ۔۔۔ مگر ہمیشہ ہوتی نہیں ۔

ان میں سے ایک جب ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو میرے ساتھ تم پر بھی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔۔۔ تمہارے آنسو میرے زخم پر مرہم کا کام دیتے ۔ تمہاری آہیں دل کو ڈھارس بندھاتی رہیں ۔ سچّا غم گسار دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے ۔

اور اپنے دوسرے بھائی سے ہم وزنوں کی محبت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی ۔

تم دن رات کلپ کلپ کر اپنے اسی منہ بولے بھائی کی زندگی اور صحت کی دعا مانگا کرتیں۔

یہ بھائی جس سے سات سال کی عمر میں تم نے یہ پوتر ناتا جوڑا تھا اور ستّر برس کی عمر تک اسے نباہ گئیں

اور یہ عالم فاضل بھائی شہرت اور عزت کی اونچی چوٹی پہ براجمان بھائی ــــــ اپنی اس منہ بولی غریب، کم حیثیت بہن سے محبت کرتا تھا کتنی عزت کرتا تھا۔ یہ صرف میں جانتی ہوں اور شائد تمہارا دل۔

سال بھر پہلے اس کی بیماری کی خبر سُن کر تم ہزار میل سے دوڑی چلی آئیں۔ اور کس دل سوزی، کس محبت، کس خاموشی سے تم اس کی خدمت اور دلسوزی کی دل رہی کرتی رہیں۔

مگر تمہاری صحت گر رہی تھی۔ ہاتھ پیر جواب دے رہے تھے اور تم سمجھ رہی تھیں کہ اب خدمت کا دم ختم ہو رہا ہے۔ خدمت لینے کا وقت آ چکا ہے اور یہ تم بھی جانتی تھیں ــــ ہاں اس حقیقت کی بھی شناسا تھیں کہ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں سب اپنے ہوتے ہیں۔ جب یہ رفیق ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تو اکثر اپنے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔

تم نے مجھ سے کہا ــــ اب مجھے گھر بھجوا دے، اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں بہت دن نہ جیوں گی۔

میں سمجھ رہی تھی ــ یہ ماں کی ممتا بول رہی ہے جو بیماری دکھی میں اپنے بچے کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ تم جانتی تھیں تمہارے پاس دکھ اس احساس کو صرف میں سمجھ سکوں گی اور میں نے تمہاری خواہش پوری کردی

تمہیں گھر پہونچنے کا انتظام کر دیا۔

سب روکتے رہے مگر تم اپنے گاؤں چلی گئیں۔ پریشان سی و بدحواس سی۔ کھوتی ہوئی سی۔ مجھے بار بار گلے لگاتیں۔ لڑکیوں کو بار بار پیار کرتیں اور اپنے بھائی کی بار بار بلائیں لیتیں .... جو تمہیں دلاسا دیتے رہے، سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا۔ جلدی واپس آنے کیلئے کہا۔

میں رو رہی تھی کہ مجھے اب تم سے ملنے کی امید نہ تھی۔ تم رو رہی تھیں کہ تمہیں اب کسی سے پھر ملنے کی آشا نہ تھی۔ مگر وہ مسکرا رہے تھے فقرے کس رہے تھے۔

ہاں تم چلی گئیں!

جو اندیشہ تھا وہ صحیح نکلا۔ تمہیں فالج کا اثر ہو گیا تھا۔ عجیب و غریب فالج جس میں سب عضو بیکار نہیں ہوتے ہیں پھر بھی انسان وہ نہیں رہتا جو تھا۔ تم ناموں کو گڈمڈ کرنے لگیں۔ چہرے پہچان لیتیں۔ مگر نام لیتے لیتے زبان لڑکھڑا جاتی۔ شعور کی لہر کبھی آتی۔ کبھی ٹوٹ جاتی۔ تم بہک جاتیں — اور اس احساس سے کہ تم بہک گئی ہو کرب کی ایک لہر سارے وجود پر چھا جاتی۔

مگر اس عالم میں بھی تم مجھے نہیں بھولیں — اپنے "بھائی" کو نہیں بھولیں۔ [illegible] اپنے بچوں کو نہیں بھولیں۔ تمہارے خط آتے رہے دوسروں سے لکھوائے ہوئے۔ تم اور تمہارا خاندان لکھنے پڑھنے سے ایسا ہی بے بہرہ تھا جیسے ابتدائی انسان تھا۔ تم خیریت منگاتی رہیں۔ بار بار بلاتی رہیں کہ خود آنے کے قابل نہ تھیں۔

مگر تم سے ملنے کون آتا۔؟

تم ایک نیچ ذات کی غریب، اپاہج فرد — تم جواب کسی کے کام آنے کے قابل نہ تھیں — کون آتا — کون بلاتا؟ سب بنے کے ساتھی ہوتے ہیں نا؟

اور پھر ہم پر قیامت گذر گئی۔

مگر تم اس سے بے خبر رکھی گئیں۔ رکھی جا سکیں کہ تم معذور، اپاہج ان پڑھ، دنیا سے بے خبر، ایک پلنگ پر پڑی مجبور رہتی تھیں۔

جس خبر پر ہزاروں افراد رو رہے تھے۔ تم اس سے بے خبر تھیں تمہارے خاندان والے بھی یہ جانتے تھے کہ تم اس صدمہ کو سہار نہ سکو گی۔ شاید مر جاؤ — شاید پاگل ہو جاؤ —

پھر کون جانے!

یہ دل — یہ شیشے سے زیادہ نازک۔ چٹان سے زیادہ مضبوط دل — کون جانے کیا سہہ سکتا ہے کیا نہیں۔؟

کبھی ایک جنبش لب نہ سہار سکے۔ چٹان سے ٹوٹ جائے....

کبھی سکت سے سکت وار سہہ جائے اور یونہی دھڑکتا پھڑکتا رہے —

کون جانے تم بھی اس صدمہ کو سہار لیتیں — پھر شاید تم سے مل کر دل کی بھڑکتی آگ پر چھینٹا پڑ جاتا — کہ سچے غم گسار کے سینے سے لپٹ کر رو لینے سے دکھ بٹ جاتا ہے نا۔؟

مگر تم ہر بات سے بے خبر — پھر بھی بے قرار و پریشان — خط لکھواتی رہیں — مجھے بلاتی رہیں۔

میں دل کو مضبوط کر کے تمہارے پاس جانے کا ارادہ کرتی رہی

اور توڑتی رہی ـــــ ڈرتی رہی کہ تم سے مل کر ضبط کے بندھن ٹوٹ نہ جائیں گے کیا؟ کیسے ـــــ کیسے تم سے یہ سب چھپا سکوں گی؟
دن، ہفتے اور مہینے گذرتے رہے اور میں تم سے ملنے نہ جا سکی!

اور پھر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا ـــــ بس کل ضرور تمہارے پاس جاؤں گی ـــــ جانے کب ماضی کے پیار کا یہ آخری بندھن بھی ٹوٹ جائے۔ اس سے پہلے میں تمہیں ایک نظر دیکھ تو لوں۔
مگر اس رات دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اور وہاں تمہیں کھڑا دیکھ کر حیرت سے میں دم بخود رہ گئی۔
تم کہ اپنے گھر میں دو چار قدم چلنے کے قابل نہ تھیں.... فالج کے حملے سے نیم جان و نیم حواس!
تم کہ.... کسی صاحب ثروت گھرانے کی فرد ہوتیں تو کسی نرسنگ ہوم میں نرسوں سے خدمت لے رہی ہوتیں یا کسی عام فارغ البال خاندان سے ہوتیں تو پلنگ پر پڑے پڑے گھر والوں سے خدمت لیتیں دوا علاج کراتیں۔ دوسروں کو ستاتیں اور اپنی انانیت کو تسکین دیتیں۔ اپنی فرسٹریشن نکالتیں۔
تم ـــــ کیسے ـــــ خدایا کیسے ـــــ پانچ چھ گھنٹے کا بس کا یہ کٹھن سفر کر کے یہاں آ گئیں؟
بجلی کی کوند کی طرح یہ سب خیال ذہن میں سے گذر گئے!
تم ہاتھ میں لوٹا پکڑے، بغل میں چادر دبائے، کانپتی دُبلی

ٹانگوں پر اپنے بے ڈھنگے بھاری جسم کا بوجھ اٹھائے کھڑی تھیں۔ ویسی ہی صاف ستھری، پاک پاکیزہ، مگر ـــ ہمیشہ کی طرح چہرے پر مسترت نہ تھی ہونٹوں پہ پیار بھری مسکراہٹ نہ تھی۔ ہاتھ پیر میں لرزشں۔ آوازمیں لڑکھڑاہٹ چہرے پر بیماری اور پریشانی کے تاریک سائے اور آنکھوں میں درد وغم کا ساگر۔

تم آئیں ـــ مگر کس حال میں۔

مگر اب بھی ہر کسی پر محبت کی برکھا ہو رہی تھی۔ ہر ایک کو یاد کیا جا رہا تھا۔ سب سے ملنے کی خواہش کی جا رہی تھی۔ الفاظ اور دماغ میں ہم آہنگی نہ تھی مگر محبت اپنا کرشمہ دکھا رہی تھی۔

مگر تم آئی تھیں۔ اصل مقصد تو یہی تھا ـــ تم آئی تھیں یہاں کہ اپنے بھائی سے مل لو ـــ کئی ہفتے سے تم بے قرار تھیں۔ تمہارے خاندان والے ٹھیک سے بات نبانا بھی تو نہ جانتے تھے۔ تم ان کو برا بھلا کہتی اور کوستی رہیں کہ میرے بھائی کی خیریت منگا کر دو اور جب دل کو قرار نہ آیا تو بیٹے کو لے کر چل پڑیں۔

کون سی حس تھی یہ جس نے تمہارے دل کو خبر کر دی تھی۔

تم ماں نہ تھیں کہ ممتا تڑپ اٹھتی ہے۔ بہن یا بیٹی نہ تھیں کہ کہا جاتا ہے خون کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ کسی کو کچھ ہو جائے تو یہ خون ملک اٹھتا ہے؟

تم تو خالی ایک خدمت گذار تھیں۔ ایک غریب چاہنے والی منہ بولی بہن ـــ

پھر کیسے تمہارے دل کو خبر ہو گئی ؟
تم نے بلک کر، ہاتھ جوڑ کر، جیسے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا۔
"سچ بتا ۔ سچ کہیو ۔ بھائی ۔ بھائی کیسے ہیں ؟"
یہ لمحہ ۔ آہ ۔ یہ جان لیوا لمحہ آخر آ گیا ۔ جس کے خیال سے میں لرز رہی تھی ۔ !
کون سا جذبہ تھا جس نے مجھ سے یہ کہلوا دیا ۔ " وہ تو اچھے ہیں ۔ علاج کے لئے امریکہ گئے ہیں ۔" آواز کتنی ہموار تھی ۔ جو لفظ دل چھید کر نکل رہے تھے ۔ وہ کتنے پرسکون انداز میں ادا ہوئے تھے ۔
مگر تمہارے چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں ۔ تم ایک ٹک مجھے تک رہی تھیں ۔ اور میں اسی جد و جہد میں تھی کہ تم میرا چہرہ نہ پڑھ سکو !
لوگ آتے رہے اور تم سے ملتے رہے ۔ تم ہر ایک سے ایک ہی سوال کرتیں ۔ اور وہ صبر کی سل کلیجہ پر رکھ کر میرا تبایا ہوا جواب دہرا دیتا اور پھر ۔ نیند کی گولی کھلا کر، تمہارا ہاتھ ہاتھ میں لے کر میں تم سے نارمل انداز میں باتیں کرنے کی کرتی رہی ۔ تم جس حال میں بھی ہو مجھے عزیز ہو !
مگر ۔ تم جیسی زندگی سے بھرپور ہستی کی معذوری ، نیم زندگی میرا دل مسوستی رہی ۔ تم بار بار میرا ہاتھ اٹھا کر چوم لیتیں ۔ اور میں یہ سب جھیلتی رہی ۔ تم سو گئیں ۔ میری رات بھی بیت گئی ۔
صبح ہو گئی ۔ رات بھر وہ دروغ مصلحت آمیز میرے

سینے میں اٹکا رہا ۔ رات بھر جان لیوا سچائی مجھے نگلتی رہی !

اور دن ـــــ وہ تو رات سے زیادہ سخت تھا کہ تم بار بار سوالات کرتی رہیں ان کے بارے میں ، ان کے خط کے بارے میں ، ان کے آنے کے بارے میں !

میں تمہیں کیسے بتاتی کہ وہ اس مقام پر ہیں جہاں سے ازل سے نامہ و پیام بند ہے ۔ میرا سپاٹ لہجہ دوسروں کو رلا رہا تھا ۔ مگر میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتی تھی ـــــ تم اس بے کراں محبت کے ساگر کی بوند ۔ جو کبھی میرا حصہ تھا ۔ تم بھی کہیں بحر فنا میں ضم نہ ہو جاؤ ۔

اور پھر تم جانے کے لئے تیار ہو گئیں ۔ تم کہ پہلے آتیں تو مہینوں سے پہلے واپس نہ جاتیں ۔ نہ جانے دی جاتیں ـــــ آج میں گھنٹے بعد تم جا رہی تھیں ـــــ یہ سمجھ کر کہ اب تم مجبور و معذور کو کوئی نہیں روکے گا ـــــ آج تم کسی کی خدمت کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں نا ؟ خود خدمت کی محتاج تھیں ۔

ہم میں وہ جذبہ ، وہ حوصلہ ، وہ ہمت کہاں تھی جو تمہیں روکتے ـــــ خدمت کرتے اور اس سیوا کا بدلہ چکاتے جو تم عمر بھر سب کی کرتی رہیں ۔ ہم بھلا کیسے ایک غیر کی خدمت کا بار اٹھاتے ـــــ جو اپنوں کی خدمت بھی کرنے سے گریز کرتے ہیں ۔

ہم ـــــ جن کے پاس وسائل تھے ، موٹریں ، پیسہ ، تم سے ملنے نہ جا سکے ۔ تم دکھ اٹھا کر ملنے آئیں تو بعض نے تم سے ملنے چار قدم پر آنے کی زحمت نہ اٹھائی ۔

تم ـــــ ممتا کی جان ، خدمت کا پیکر ، سیوا کی مورتی ہو تو ہوا کرو

ہم خود اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔

ہاں ہم نئی تہذیب کے مارے، نئے کلچر — کھوکھلے کلچر کے سلامی — خودنمائی، خود پرستی کے شکار — اپنی حالت کے بھنور میں چکر کھاتے ہوئے انسان!

ہم — جو کائنات کا محور صرف اپنی ذات کو سمجھتے ہیں۔

ہم جن کو اس پر غصہ اور جلن ہے کہ ساری دنیا اور خود خالق کائنات ہماری خواہش اور مرضی کا پابند کیوں نہیں؟

ہم کہ اس "فرسٹریشن" میں خدا کے منکر اور انسانوں سے بیزار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم کہ — "ذہنی تنہائی، وجودیت کا کرب، زندگی کا دکھ، محرومی، ناکامی، لفظوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔

ہم — سکون و طمانیت سے کوسوں دور — اپنی آگ میں خود ہی جلتے ہیں۔

ہم جو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی — کچھ نہ ہونے کے دکھڑے روتے رہتے ہیں۔

ہم کہ زندگی کو سورگ بنانے کی جگہ نرک بنانے پر تل گئے ہیں۔

ہم — جو لینا جانتے ہیں دینا نہیں۔

ہم — جو اپنی اولاد کو بھی سچی ممتا بھری محبت نہیں دے پاتے۔

ہم میں اکثر ایسے بھی ہیں جو ہزاروں میں کھیلتے ہیں، اسراف بے جا کرتے ہیں پھر بھی تنگی کا رونا روتے ہیں۔

آہ! ہم ـــ جو خود غرضی، بے یقینی اور بے ذاری کے جال میں پھنسے پھڑپھڑا رہے ہیں ۔ کاش ہم ۔ تم ـــ اور تم جیسوں کو سمجھ سکتے ۔

تمہاری سیرت کا حسن، شخصیت کی دلکشی، تمہاری محبت کی وسعت، خدمت کی لگن، تمہارا سچا ایثار، بے لاگ قربانی کا جذبہ، تمہارا ایمان و یقین! کاش ـــ اے کاش یہ صفات اور زیادہ عام ہوتیں ۔ یہ جذبے زیادہ فراواں ہوتے ۔

مگر تم ہو کیا؟

یہ فنکار بھی عجیب مخلوق ہوتا ہے، جسے چاہے آسمان پر چڑھا دے، جسے چاہے پاتال میں گرا دے ۔

تم ایک معذور و بے بس ہستی، نچلے طبقے کی جاہل، ان کلچرڈ بوڑھی عورت، تم میں ہے کیا بھلا؟

اور تم چلی گئیں .... چلتے وقت ایک بار پھر تم نے مجھے اپنے سینے سے بھینچ لیا ـــ درد محبت کی گرمی کی لہر، تمہارے جسم سے میرے جسم و روح میں سرایت کر گئی ۔

تم چلی گئیں ......

میرے زخموں کو کرید کر ......

میرے دماغ کی طنابیں کس کر ......

اور تم سے لپٹ کر جی بھر کر رونے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی ۔

مگر نہیں ـــ نہیں ـــ تم میرا غم بٹانے آئی تھیں ۔

تمہاری یہ محبت ، یہ اپنائیت ، یہ احساس ، کیا زخم پہ مرہم

نہیں رکھتا۔ ؟

کیا اس حالت میں صرف تمہارا آنا ہی انسانیت پر یقین پیدا

نہیں کر دیتا۔ ؟

تم چلی گئیں ....

مگر یہ رشتہ ۔ یہ درد کا رشتہ .... اور بھی

مضبوط ہو گیا۔

دنیا کی کون طاقت اسے توڑ سکتی ہے ۔ ؟ ...

اس کا سر دھیرے دھیرے جھکتا چلا جا رہا تھا۔

کہانی ختم ہوتے ہوتے آنکھیں خمار آلود ہو چکی تھیں ۔

اور اب وہ سو رہی تھی ـــــ مدت کے بعد گہری اور

پر سکون نیند ....



ضیاء نرگس

یادوں کے فانوس

— تمہارا خط مجھے چار پانچ دن ہوئے ملا — مگر یہاں کی گرمی — الاماں — یہ لگتا ہے جیسے محبت کے تمام خاب بات کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ فضا میں گرم بگولے اڑتے رہے۔ آج ایک دم بادل گھر کر آئے تو میں تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی ۔ ردم جھوم کر گھٹا برس رہی ہے۔ ساری فضا۔ خنک ہو گئی ہے۔ باہر ہلکی ہلکی نامعلوم سی پھوار پڑ رہی ہے۔ چنبیلی کی نرم و نازک کلیوں کی پنکھڑیاں نہایت خاموشی سے سامنے برآمدے میں ڈھلک کر آگری ہیں۔ ہوا کا نرم جھونکا چنبیلی کی ہلکی سی مہک چرائے میرے چہرے کو چھوتا رہا — اور بالوں کو سرسراتا گذر گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بھولی ہوئی یادیں میرے دل کو چھوتی گذر گئیں — اور ان کے نرم و نازک قدموں کی چاپ کو میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے ؎

ایک آہٹ سی ہوئی دل کے دریچے کے قریب
کون یادوں میں دبے پاؤں چلا آتا ہے

بارش کے قطرے اسی یکسانیت سے گر رہے ہیں اور اس شدید

عالم تنہائی میں بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کے جھروکوں سے مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ میں ڈر جاتی ہوں۔ گھبرا کر پیچھے کی اور دیکھتی ہوں تو ان جھروکوں سے تمہارا چہرہ ابھرتا ہے اور پھر یہ نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں میں اپنے خیالات کو جھٹک دیتی ہوں، مگر یہ خیالات میرا پیچھا کب چھوڑتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان یادوں کے خارزاروں سے دامن جھٹک کر اپنی زخمی روح سمیت ایک ایسے انجانے دیس میں نکل جاؤں جہاں کے چاروں اور اندھیارے میں ڈوب کر رہ جاؤں ـــ مگر کاش یہ ممکن ہوتا ـــ یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں ہے، ہر وہ بات جو میں چاہوں پوری ہو جائے اور میری تو آج تک کوئی بھی خواہش پوری نہ ہوئی ـــ نہ جانے کیوں ـــ جسے چاہا وہ بچھڑ گیا ـــ جس سے دوستی کی وہ آگے نکل گیا ـــ اور میں تنہا رہ گئی۔ ہر دوسرا دوستی کا یقین دلاتا ہے مگر اس کے باوجود بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ بس تنہا ہوں ـــ میرا کوئی ـــ کوئی نہیں ـــ اچھے ساتھی ملنا کتنا مشکل ہیں۔ ـــ میرے اچھے ساتھی ـــ میرے ہمدم! تم کہاں ـــ تم کہاں ہو ـــ؟

برابر میں میری بچی سو رہی ہے۔ سوتے سوتے وہ ایک لمبی سی سسکی لیتی ہے اور میں اس پر جھک جاتی ہوں ـــ میرے آنسوؤں کی شبنم کے قطرے میری آنکھوں سے ڈھلک کر اس کے پھول جیسے گالوں پر گرتے ہیں ـــ میں انھیں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیتی ہوں۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے ـــ اور میرے بالوں کو پریشان کر جاتا ہے ـــ میں چہرے پر آئی لٹوں کو پیچھے جھٹک کر تمہیں خط لکھنے میں مصروف ہو جاتی ہوں اور تمہارے متعلق سوچتی

ہوں تو مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا ہے ـــــ کچھ عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے ـــــ گو میرا بچپن کوئی خاص حسین نہیں گذرا ـــــ مگر پھر بھی ـــــ اب بھی ان دنوں کی یاد آتی ہے تو جیسے میرا جی اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے۔

شائد تمہیں یاد ہو کہ دادا ابّا بھی بھول بھلیوں والی حویلی میں۔ میں تم اور میری رشتہ کی بہنیں اور بھائی ـــــ ہم لوگ سارا وقت اودھم مچایا کرتے ـــــ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں جبکہ سارا گھر خس کی ٹٹیوں لگے کمروں میں آرام کرتا، ہم سب بچے تینگوں کے فراق میں ننگے پاؤں جھتوں جھتوں بھاگتے پھرتے ـــــ میں بچپن میں بے انتہا شریر تھی ـــــ میں نے کبھی لڑکیوں کی طرح گڑیاں نہیں کھیلیں نہ ہنڈکلیا پکائی ـــــ بلکہ مجھے تو ہمیشہ ان کھیلوں سے ازلی بیر رہا۔ جب کبھی بھی کسی گڑیا کی شادی ہوتی تو میں کبھی لڑکیوں کا ساتھ نہ دیتی بلکہ بارات میں ہلڑ باز لڑکوں کے ساتھ اُدھم مچاتی ہوئی آتی۔ سارا وقت تینگوں کے چکر میں ماری ماری پھرتی ـــــ میرے بابا اور امی ان باتوں سے بہت پریشان تھے۔ وہ مجھے سمجھاتے اور میں روز وعدہ کرتی کہ اب کبھی دوپہر میں نہیں کھیلوں گی ـــــ مگر دوپہر آتے ہی میں تمام کے ہوئے وعدے بھول جاتی ـــــ میں نے سنا تھا کہ میرے پیدا ہوتے ہی میری پھوپھی یعنی تمہاری امی نے مجھے تمہارے لئے مانگ لیا تھا۔ اس کا شائد تمہیں بچپن ہی سے احساس تھا۔ تم مجھے خواہ مخواہ دبانے کی کوشش کرتے۔ خود شرارت کرتے اور میرا نام لے دیتے جس پر مجھے خوب ڈانٹ پڑتی ـــــ میں رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ـــــ اپنی امی اور بابا

سے اس وقت تک روٹھی رہتی جب تک کہ وہ مجھے منا نہ لیتے ۔ میرے بابا
جتنا مجھے پیار کرتے اتنا ہی میرے اوپر سختی کرتے ۔ ان سختیوں کے
باوجود بھی میں ایک سے ایک نئی شرارت کرتی اور اسی طرح ہنستے کھیلتے
میرا بچپن گذر گیا ۔

جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی میرے ذہن میں یہ خیال پختہ
ہوتا گیا کہ مجھے تمہارے ساتھ زندگی گذارنی ہے ـــــ میری شرارتوں
میں کوئی فرق نہ آیا ـــــ کالج کی ہر ادھم بازی میں میرا ہاتھ ہوتا ۔
اتنی شوخ و شنگ ہونے کے باوجود بھی جب میں تمہیں دیکھتی میری
شوخی رخصت ہو جاتی ۔ تمہارا مزاج بھی عجیب تھا ـــــ تم مجھے ستا کر
خوش ہوتے ۔ حالانکہ تمہارا دوسروں کے ساتھ رویہ بہت اچھا تھا ۔ تم
اکثر و بیشتر لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر لمبے لمبے قہقہے لگاتے اور میں جب بھی
اتفاقاً کسی کام سے وہاں پہونچ جاتی تم فوراً خاموش ہو جاتے ـــــ میں
فوراً وہاں سے ہٹ آتی ۔ میرا جی اندر ہی اندر ڈوبنے لگتا ـــــ اپنے
کمرے میں کتابوں پر جھکی رہتی ۔ مگر کان تمہاری آواز پر لگے رہتے ۔۔
میری کبھی بھی سمجھ میں نہ آتا کہ تمہارا رویہ اتنا کیوں عجیب تھا ـــــ شائد پھوپھی
اماں کے بے جا لاڈ پیار نے تمہیں خود سر بنا دیا تھا کہ تم اپنے آگے کسی کو
کچھ نہیں سمجھتے تھے ۔ مگر مجھ میں اور سب لوگوں میں تو بہت فرق تھا ـــــ میں نے
بڑے عیش میں زندگی گذاری تھی ۔ مجھے تو صرف تمہارے سہارے کی
ضرورت تھی ۔

عورت کتنی ہی پڑھ کیوں نہ جائے مگر اسے ایک مضبوط سہارے

کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ زندگی کی تاریک راتوں میں اسے سہارا دے سکے۔ جانے ہر عورت کی یہ فطرت کیوں ہوتی ہے کہ مرد کی زندگی میں وہی پہلی اور آخری روشنی بن کر جھلملائے ـــ اور اس کے بعد گھور اندھیرا چھا جائے مجھے شاید یہی کچھ میں بھی چاہتی تھی ـــ مجھے کبھی کبھی اس بات کا احساس ہوتا اگر لوگ مجھے اس بات کا احساس نہ دلاتے کہ مجھے تمہارے ساتھ سارا جیون نبھانا ہے۔ تمہاری لاپروائیوں کے باوجود بھی مجھے اطمینان سا تھا کہ تم میرے ہو اور میرے گرد خوشبو سے لدے جھونکے تیرتے رہے۔ مجھے تم پر بڑا مان تھا ـــ اس لئے کہ میں نے اور تم نے اپنا بچپن ساتھ نبایا تھا ـــ اگر بچپن کی یادیں اسی طرح بھلائی جا سکتی ہیں تو میں تمہیں بھی بھلا دوں گی ـــ مگر نہیں ـــ ٹھہرو۔ شائد میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ میرے ذہن میں ایک ایک کر کے ماضی کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ تم اندر آ کر دیکھو ان یادوں کے شیش محل میں تمہیں اپنا ہی عکس نظر آئے گا۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ تم یورپ چلے گئے۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ میں تمہیں نظرانداز کئے رہتی ہوں اور شائد کوئی اور ہے جسے میں نے اپنے خیالوں میں لبا رکھا ہے ـــ تمہارے سوچنے کا انداز کتنا پست تھا۔ جانے تم مجھ سے کس بات کی توقع رکھتے تھے۔ تمہیں کیا معلوم کہ جو جادو بن کے ان کہے بولوں میں ہے ـــ وہ کہہ دینے میں کہاں ہے ـــ کیا سب کچھ کہہ دینے کی بھی ضرورت تھی۔ تم نے کبھی ان خاموش نگاہوں کو دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی جو کہ بڑے مان سے تمہارے ہی اوپر اٹھا کرتی اور جھک جاتی۔

پھوپھی امی تمہارے آنے کے دن گنا کرتیں اس لئے کہ تم ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ وہ بڑے ارمانوں سے شادی کی تیاری میں منہمک تھیں اور میں نم پلکیں اٹھائے اداس دیکھتی رہ جاتی کہ یہ کس چیز کی تیاری کر رہی ہیں—— انھیں کس کا انتظار ہے—— بہار آئی۔ خزاں ہوئی—— خزاں ہوئی بہار گذر گئی—— تم نہ آئے مگر تمہارا خط آیا—— تم نے وہیں شادی کر لی تھی—— پھوپھی امی نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے تھے۔ رو رو کر آنکھیں اندھی کر لیں۔ ان کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے بابا کو کیا منہ دکھاتیں۔ میری بچپن کی مانگ چھٹ گئی تھی۔ بابا اور امی بھی دل برداشتہ رہتے—— پوری حویلی میں ایک سناٹا رہتا—— جہاں پر کہ قہقہے گونجا کرتے۔ میں سارے گھر میں چور بنی پھرتی—— جیسے یہ سب کچھ میرا کیا دھرا ہو—— میری شوخی ایک بجھے ہوئے انگارے کی طرح ذرا سی روشنی دکھا کر ختم ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرا وجود اندر ہی اندر سلگ رہا ہو لیکن اس خاموش—— اکتائی اور بجھی زندگی سے مطابقت پیدا ہو چلی تھی۔ اس کے باوجود بھی ذہن یادوں کی بازگشت کی آماجگاہ بن کے رہ گیا تھا۔ اک کرب مسلسل—— ایک خلش—— تم نے ایسا کیوں کیا—— تم نے آخر ایسا کیوں کیا——!!

میں اپنے تصور سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر یہ کبھی نہ ہو سکا—— میرے ذہن میں یادوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا۔ پوری حویلی کو ایک مہیب سناٹے نے گھیر لیا تھا اور میں کھوئی کھوئی چاندنی راتوں

میں پرانی یادوں کو سینے سے لگائے خاموشش سر نیہوڑائے چاند کو تکا کرتی ۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے صحن میں لگے ہوئے درخت ۔ جھلی ہوئی بیلیں لمبی محرابوں والے دالان آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں اور بھولی بسری داستانوں کو دہرا رہے ہوں ۔ انھوں نے مجھے خوشی سے قہقہے لگاتے بھی دیکھا ہے اور اب خاموشی سے آنسو بہاتے بھی دیکھتے ہیں ۔ اکثر یہ لگتا ہے کہ جیسے سارا گھر ہولے ہولے سانسیں لے رہا ہو ۔ میں ویران ۔ تنہا لٹی لٹی سی جانے کب تک اسی حالت میں بیٹھی رہتی ۔ اور رات کے جانے کتنے پہر ، شبنم سے نم بستر پر خاموشی سے گر کر سو جاتی ۔ تم کہو گے کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ۔ نئی کہانی نہیں ۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے ۔ بزرگ اکثر و بیشتر ایسی غلطیاں کرتے ہیں اور خمیازہ ان کی اولاد بھگتتی ہے ۔ تمہارے نزدیک اس میں جدت نہ ہو ۔ ساری دنیا ویسی ہی تھی ۔ خوشبوؤں سے بھری ہوئی ۔

مگر میرے لئے اس میں کچھ نہ تھا ۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے جی پر کیا قیامت گذر گئی ۔ جتنی میں کالج میں شوخ و شنگ تھی اتنی ہی مجھے ہر چیز سے نفرت ہو گئی اور میں خاموشی سے تھرڈ ڈویژن میں بی اے کر کے گھر بیٹھ گئی ۔ سب نے مجھے بہت سمجھایا ۔ آگے پڑھنے پر اکسایا ۔ شائد میرے دکھوں کا اسی طرح مداوا ہو ۔ مگر میں کسی طرح تیار نہ ہوئی ۔ لمحے پہ لمحے گذرتے رہے اور میرے دکھ کا مداوا کوئی نہ کر سکا ۔ اور مجھے رہ رہ کر ریتیں کا یہ شعر یاد آرہا ہے ۔ !!

مری تخلیق لمحوں سے ہوئی تھی !

میں اک فریاد بن کر رہ گیا ہوں

اس منزل پہ آکے میں حیران و ششدر کھڑی ہوں۔ جہاں پر آکر انسان جذبات و احساسات کو قطعی گنوا بیٹھتا ہے — اب نہ مجھے کسی شے کے حصول میں آسودگی نظر آتی ہے اور نہ ہی کسی شے کی محرومی سے رنجیدہ اور ملول ہوتی ہوں بس ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہی ہوگا۔ یہاں کون سے ارمان دل میں ہیں — ؟ اکثر میں خواب دیکھتی — کہ میں تنہا چلی جا رہی ہوں مجھے راہ سجھائی نہیں دیتی — بال پریشان ہیں اور دامن — راستے کے خارزاروں سے تار تار — پاؤں تھک کر شل ہو جاتے ہیں اور راہ نہیں ملتی۔ تھک کر گر پڑتی ہوں — اکثر سوتے میں سسکیاں لے لے کر رونے لگتی —

میرے بابا اٹھ کر آتے اور پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے۔ میری بچی — تم کیوں رو رہی ہو — کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا — میں آنکھیں کھول دیتی۔

"نہیں تو بابا۔" وہ اداسی سے میرا چہرہ دیکھتے رہتے۔ انھیں میرے دکھ کا احساس تھا۔ انھوں نے کبھی زبان سے کچھ نہ کہا مگر ان کی آنکھیں بتا دیتیں کہ وہ میری وجہ سے پریشان ہیں۔

اور میرے دکھ کا مداوا کرنے کے لئے انھوں نے کافی سوچ بچار کے بعد میرے لئے جیون ساتھی چنا۔ جس کو میں قطعی نہ جانتی تھی۔ تمہارا خیال — صورت میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ بابا کے کہنے کے مطابق مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی — تمہارا مضبوط سہارا تو کبھی کا چھوٹ

چکا تھا۔ شائد عورت کی فطرت یہی ہوتی ہے کہ جو اس کو ٹھکرائے اسی کی چاہت میں اپنے آپ کو ختم کر دیتی ہے۔!

میں بابل کے سینے سے لگی روتی رہی۔ "بابا مجھے اپنے سے جدا نہ کیجئے۔ میں آپ کے پاس رہوں گی بابا۔" وہ میرے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہے۔ "آج تک کوئی اس طرح رہا ہے میری بچی، جو تم رہو گی۔؟"

"وہ شب برات کی رات تھی۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے سمجھایا۔

"جاؤ اپنے نام کی شمع روشن کرو، اپنے لئے اچھی اچھی دعائیں مانگو۔ خدا تمہارا مستقبل خوشگوار بنائے۔ آج کی رات دراجابت کھلا رہتا ہے۔" باہر آتشبازی چھوڑی جا رہی تھی۔ "انھوں نے میرے نام کی شمع روشن کی، شمع پگھلتی رہی اور میری آنکھوں سے آنسو ڈھلکتے رہے۔ میرے منہ سے ایک بھی دعا نہ نکلی۔ ان کے ہٹتے ہی میں نے پھونک مار کر اپنی شمع بجھا دی۔ شمع کے اسطرح بجھ جانے کو اچھا شگون نہیں سمجھتے۔ مگر مجھے ان تمام باتوں کی کیا پرواہ تھی۔

میرے لئے تو ہر اچھا شگون برا شگون تھا۔!

پھر ایک دن ایسا آیا۔ باہر صحن میں ڈھولک پر سہاگ گائے جا رہے تھے۔ میری سہیلیاں میری مانگ میں افشاں چنتی رہیں۔ میری پلکوں سے ستارے ٹوٹتے رہے اور میرا دل تمہیں پکارتا رہا تم کہاں ہو۔ تم کہاں ہو۔ اور میں آنکھیں بند کرکے ایک انجانے دیس میں آ گئی۔ جب میں نے بوجھل پلکیں اٹھا کے دیکھا۔ تو وہاں میں تھی۔ میرے زندگی بھر کے ساتھی، میرے ہمدم۔ میرے شوہر تھے۔ میرے پاس روپیہ تھا جس کی مجھے قطعی ضرورت نہ تھی۔ حیلمان تے

کپڑے تھے جن کا مجھے قطعی شوق نہ تھا۔ سب طرح کے عیش و آرام تھے۔ اگر میں اس پر بھی خوش نہ رہتی تو مجھ پر سو مرتبہ لعنت تھی۔ میرے شوہر مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ مگر جانے کیا بات ہے کہ یہ لگتا ہے کہ جیسے میں سالہا سال سے صدیوں سے بھاگتی چلی آ رہی ہوں ــــ مجھے یوں ہی یادوں کے راستے پر دوڑتے رہنا ہے، بھاگتے رہنا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں۔

اب شام کا دھندلکا پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ سیاہ بدلیوں میں تیرتا ہوا نیلا سا چاند آکاش پر ڈگمگا رہا ہے۔ شام اور بھی گہری اداس ہو گئی ہے۔ یہ شامیں مجھے اور بھی اداس کر دیتی ہیں ــ سامنے افق پر اکیلا ننھا سا تارا چمک رہا ہے۔ اسے میں دیکھتی ہوں اور تمہارے لئے دعا مانگتی ہوں اور میرا جی بھر آتا ہے۔

تمہارا خط سامنے کھلا پڑا ہے ــــ تم ابھی یورپ سے کچھ دن ہوئے لوٹ کر آتے ہو۔ میری شادی پر تم نے بڑے اجنبی انداز میں مجھے مبارکباد دی ہے ــــ اور اپنے گھر بلایا ہے۔ بلانے کا بہت بہت شکریہ ــــ!

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے خط کا جواب دوں گی۔ ہرگز نہیں۔ یہ طویل خط بھی اور خطوط کی طرح جو کہ میں اداسی اور پریشانی کے عالم میں لکھتی تھی نذر آتش ہو جائے گا ــــ اور اب پتہ نہیں کیوں جیسے میرے دل کا قرار سا کہیں گم ہو گیا ہے۔ ہر آہٹ پر دل دھڑکتا ہے جیسے کوئی ہے ــــ کوئی مجھے اپنی اور بلا رہا ہے ــــ شاید تم ــــ کہیں موت تو نہیں! ــــ نہ معلوم کون؟



رشید ہ خان

اَن داتا

میں نے جب آنکھ کھولی تو یہی سنا اور سمجھا کہ راجہ اس شخص کو کہتے ہیں جو شراب پیتا ہے، ریس کھیلتا ہے۔ عیاشی کرتا ہے۔ اور بڑے بڑے بڑے جرائم کر کے بھی جیل نہیں جاتا بلکہ دربار میں بیٹھ ان (اناج) کھلانے والوں کا گلا کاٹ کر ان داتا کہلاتا ہے۔ اس کے کپڑے پیرس میں ڈھلتے ہیں۔ شراب فرانس سے آتی ہے۔ علاج یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹر کرتے ہیں اور اس کے بچے لندن میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس کے ریس کے گھوڑے پھل اور میوہ جات کھاتے ہیں اور ان سب خرافات کا بوجھ بھوکے، مفلس اور جاہل عوام کے کاندھوں پر رکھا جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک ان داتا کی سرزمین نرسنگھ گڑھ میری ننھیال تھی جہاں اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے وہ شاندار قلعہ اندر سے بھی دیکھا ہے جو ایک پہاڑی پر بنا ہے اور جو اپنے وجود میں ہزاروں داستانیں چھپائے آج بھی کھڑا ہے مگر ویران اور بند ہے اور جو اب صرف ایک یادگار ہے۔

اس قلعہ میں کبھی ایک دنیا آباد تھی۔ راجہ صاحب سو اپنی رانیوں
کے یہیں رہا کرتے تھے۔ پورے قلعہ میں بساط سیاست بچھی رہتی تھی۔ آقا
سے لے کر نوکر تک اس بساط پر اپنے اپنے مہرے چلاتے نظر آتے تھے۔ ایسے
جوڑ توڑ ملائے جاتے تھے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

اس قلعہ کے لوگ دو پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے ایک بیوہ
رانیاں اور ان کے ملازم جو قلعہ کے پچھلے حصے میں بسے ہوئے تھے اور
دوسرے راج بھون کی رانیاں اور ان کے نوکروں کا ایک لشکر۔

بیوہ رانیاں جو داتا یا رانی ماں کہلاتی تھیں۔ آپس میں بڑے
چھوٹوں کی دیواروں سے منقسم تھیں۔ وہ رانیاں جو کسی راجہ کی بیٹیاں
یا بہنیں تھیں ان کی جاگیریں مقرر تھیں۔ جو رانیاں جاگیر دار گھرانے سے
تعلق رکھتی تھیں ان کی تنخواہیں مقرر تھیں ان جاگیروں اور تنخواہوں
میں بھی مرتبے کا خیال رکھا گیا تھا۔

ان رانیوں کے علاوہ ایک قسم رانیوں کی اور بھی تھی جنھیں
نہ رانی کہہ سکتے تھے اور نہ لونڈی۔ ان کی بہت معمولی تنخواہیں مقرر تھیں۔ قلعہ
کی زبان میں انھیں پاسوان کہا جاتا تھا۔ پاسوانیں بیاہتا نہیں ہوتی تھیں۔ جو لونڈی
راجہ صاحب کی نظر میں مقبول ہو جاتی اس کے پاؤں میں سونے کا ایک کڑا ڈال د
جاتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب یہ معمولی لونڈی نہیں رہی بلکہ اسے راجہ
صاحب کے بستر تک پہونچنے کا پورا پورا حق حاصل ہو گیا ہے۔

ان سب رانیوں اور پاسوانوں سے بھی جب راجہ صاحب کا دل
جاتا تو وہ ریاست سے باہر تفریح کی غرض سے نکل جاتے تاکہ ریاست کے

بھیڑوں سے دور رہ کر اپنی صحت بحال کر سکیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب راجہ صاحب اپنی صحت کی بحالی کے لئے کشمیر گئے تو وہاں سے ایک معمولی حیثیت کی کشمیری لڑکی کو رانی بنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ سترہ اٹھارہ سال کی یہ کشمیری لڑکی حسن کا ایک نادر نمونہ تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بن پیئے مخمور رہتی تھیں اور گالوں پر ہمیشہ گلاب کھلے رہتے تھے۔

راجہ صاحب بھی اپنی سدھ بدھ بھول کر اسی کے ہو رہے۔ ایک سے ایک قیمتی ہیروں اور جواہرات سے رانی کا جسم سجا دیا۔ اطلس و کمخواب میں سر سے پیر تک ڈھانک دیا۔ اشارے پر دوڑنے والے خادموں کی ایک فوج عطا کر دی گئی۔ کئی گاؤں جاگیر میں مرحمت فرما دیئے۔ محل میں روز ہی کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام رہتا تاکہ اس آزاد پنچھی کا دل پنجرے کے پنجرے میں گھبرا نہ جائے اور وہ خوش رہے۔

مگر نہ جانے کیوں رانی کا دل نہ ہیرے جواہرات سے خوش ہوتا نہ ناچ رنگ کی محفلوں میں لگتا اور نہ کنیزوں کے سوانگ بھرنے پر ہنستا۔ وہ اس طرح قلعہ کی ایک ایک بات کو دیکھتی جیسے کوئی نوگرفتہ ہرنی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتی ہے۔ ہاں اسے اگر کہیں سکون ملتا تو وہ تھی اس کی منہ بولی کشمیری موسی کی قربت جس سے تنہائی میں بیٹھی وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔

"کیوں موسی عثمان چچا کے کھیت کے مصری مکئی کے بھٹے کتنے میٹھے ہوتے ہیں۔"

"اب تو میری بھیڑ نے میمنا دے دیا ہوگا۔ اسی کی طرح کا ہوگا۔"

گد گدا سا سفید روئی کے گالے کی طرح۔"

"موسی تجھے وہ کشمیری ملن کا گیت یاد ہے جس کی دھن الغوزہ پر چند پر بجایا کرتا تھا۔؟"

"موسی چندر نے قسم کھائی تھی کہ وہ میرے سوا کسی سے"....

اور موسی گھبرا کر اس کے نازک لبوں پر ہاتھ رکھ دیتی ــــ پھر ادھر ادھر دیکھ کر سمجھاتی۔

بیٹی۔ پچھلی باتیں بھولنے میں ہی بھلائی ہے۔ سنجوگ تو مقدر کی بات ہے اور ایک ہندو عورت تو اپنے خاوند کے سوا کسی اور کا دھیان کرنا بھی پاپ سمجھتی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ بھگوان نے تمہیں اتنی بڑی رانی بنا دیا۔ ایسے کس کے بھاگ ہوتے ہیں اور پھر راجہ صاحب تمہارا کتنا ژلار کرتے ہیں۔" بھگوان تمہارا سہاگ امر کرے۔"

مگر زبردستی کا سہاگ امر ہوتا تو کجا زیادہ دن قائم بھی نہ رہ سکا۔ دو سال کے اندر ہی اندر راجہ صاحب پر لوک سدھار گئے اور رانی کو، جو حسن و شباب کا چھلکتا ہوا ایک جام تھی، مجبوراً بیوگی اور بیرنگی کا لبادہ اوڑھ کر رانی ماں کا خطاب قبول کرنا پڑا۔ ساتھ ہی راج بھون خالی کر کے قلعہ کے پچھلے حصّہ میں منتقل ہونا پڑا۔ کیونکہ رسم کے مطابق راج بھون میں ریاست کا راجہ اور اس کی رانی ہی رہ سکتے تھے۔ راجہ کے مرنے کے بعد ان کا گود لیا ہوا لڑکا راجہ بن کر راج بھون میں آگیا۔ کہتے ہیں اسی وارث نے راجہ صاحب کو کسی طوائف کے ہاتھوں زہر دلا کر ختم کرا دیا تھا اور پھر طوائف کو ہزاروں روپئے

دے کر بھوپال اسٹیٹ بھجوا دیا تھا۔

وقت گذرتا گیا اور اس کی رفتار نے قلعے کے رہنے والوں کو یہ بھی بھلا دیا کہ کبھی اس راج بھون میں ایک کشمیری رانی کا راج تھا۔ جس کا منظور نظر بننے کے لئے وہ نہ جانے کیا کیا ہتھکنڈے کھیلا کرتے تھے۔ ملازم اس کے حکم کو بجالانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر کسی دن ملازم کا نام لے کر اس سے کسی کام کو کہتی تو وہ دن بھر دوسروں سے یہ بات کہتے نہ تھکتا تھا کہ آج سرکار رانی نے فلاں کام خاص طور پر مجھ سے کرایا۔

آج یہ سب کچھ صرف ایک خواب تھا۔ راج محل کی بساط سیاست الٹ چکی تھی اب اس کی جگہ نئی بساط اور نئے مہروں نے لے لی تھی۔ مگر اچانک ایک واقعہ نے سب کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ایک دن مہاراج صبح سویرے اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک کنیز خاموشی سے آکر پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جیسے ہی مہاراج گھومے اس نے آگے بڑھتے ہوئے ان کے چرن چھو کر کہا۔

"مہاراج کی جے ہو۔" اور پھر خاموش کھڑی ہو گئی۔

مہاراج نے سوالیہ نگاہوں سے کنیز کی طرف دیکھا۔ مگر جب وہ بدستور سر جھکائے خاموش رہی تو پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ان داتا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"سرکار وہ ...... چھوٹی ماں ہیں نا" لونڈی گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ کیا ہوا چھوٹی رانی ماں کو؟ مہاراج نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"سرکار، میری زبان نہیں کھلتی مگر...... آپ کی ریاست کی آن خطرے میں ہے۔" لونڈی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"صاف صاف کہو، کیا بات ہے؟ ڈرو نہیں، تمہیں کچھ بھی نہ ہوگا"

"ان داتا۔ چھوٹی رانی ماں کے پاس رات کو کوئی آدمی....؟"

"خاموش"۔ راجہ نے کڑک کر کہا۔ ان کی بھویں تن گئیں۔ اور غصہ سے آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر کنیز کے پاس رک گئے۔ جیسے اندر اندر کسی بات کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

"اگر یہ بات غلط ہوئی تو؟" انھوں نے کنیز کو مخاطب کیا۔

"ان داتا! ہمارے مائی باپ ہیں ــــ میری گردن اڑا دیجئے گا"۔

"ہوں تمہیں کیسے معلوم ہوا۔؟"

"سرکار مجھے سنتری نے بتایا تھا کہ وہ کئی روز سے دیکھ رہا ہے کہ قلعے کے پیچھے والے دروازے سے دو کنیزیں خالی کلسہ سر پر رکھے اور گھونگھٹ نکالے نکل جاتی ہیں اور تین بجے واپس آتی ہیں۔ ان کے منہ پر گھونگھٹ ہوتے ہیں مگر پھر بھی ایک کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرد ہے۔ سرکار رات بڑی رانی ماں کے کہنے سے میں نے درواز

پر کان لگا کر سنا تو اندر سے کسی مرد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے کہنے پر ہی میں آپ کے پاس۔

"تم جا سکتی ہو۔" راجہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور لونڈی اس طرح بھاگی جیسے سولی پر چڑھتے چڑھتے ایک دم معافی کا پروانہ مل گیا ہو۔

رات کی تاریکیوں نے قلعہ پر اپنا سایہ ڈال کر اسے ایک ہیبت ناک دیو کی شکل میں بدل دیا تھا۔ سردی غضب کی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند آتشدانوں کے پاس بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ صرف چھوٹی رانی ماں اس سردی سے بے نیاز کسی سے محو کلام تھی۔

"چندر، آج تو نہ جانے کیوں تمہارے الغوزے پر وہی پرانا ملن کا گیت سننے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"نہیں کنو۔ میں یہاں ایسی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا جس سے کسی کو شک ہو۔ اپنے دیس پہونچ لینے دو۔ پھر ملن سیج پر ہی وہ راگ سناؤں گا۔" چندر نے شرارت سے رانی ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اور رانی شرما کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"چندر، بھگوان جانے ہمارے سپنے کبھی پورے بھی ہوں گے یا نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اڑ کر اپنے دیس چلی جاؤں۔ یہ

۔ قلعے کی اونچی اونچی دیواریں، پہرہ دار، بندوق رکھے ٹہلتا ہوا سنتری یہ سب ہمیں کیسے نکلنے دیں گے۔؟"

بھگوان کے لئے اتنی اداس نہ ہو کمو۔ جب میں ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں آسکتا ہوں تو تمہیں باہر بھی لے جانے کی مجھ میں ہمت ہے۔ بس دو تین دن کی بات ہے۔ شیام آجائے تو پھر بند وبست کروں گا۔ لے یہ برفی کھا۔ تو شوق سے برفی کھاتی ہے نا، آج ایک بڑی دکان پر رکھی دیکھ کر مجھے یاد آگیا۔ چندر نے برفی کا دونا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دھت۔ رہا وہی گھامڑ کا گھامڑ۔ ارے مجھے یہاں کوئی برفی کی کمی ہے۔ اتنی کھاتی ہے کہ جی بھر گیا ہے۔" اب تو رانی کھلکھلا کر ہنس پڑی ــ اس کے دانت ہونٹوں پر اسطرح سج گئے جیسے گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے۔

اچانک ایک گرجدار غصّے سے کانپتی ہوئی آواز نے اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

دروازہ کھولو چھوٹی ماں ـــ کواڑوں پر مکّے برساتی ہوئی آواز پھر گونجی اور رانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز راجہ کے سوا کسی کی نہیں تھی۔ وہ ایک دم خوف سے زرد پڑ گئی جیسے کسی نے جسم کا خون چوس لیا ہو ـــ بڑی مشکل سے بولی کون ہے؟ لال (یعنی رانیاں راجہ کو لال کہتی تھیں)؟"

"ہاں، میں دروازہ توڑ دوں گا۔ چھوٹی ماں جلد کھولو۔"

"مگر میں کپڑے تو پہن لوں۔" لرزتی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔

اور جیسے ہی دروازہ کھلا۔ غضبناک راجہ معہ اپنے دو شکاری کتوں کے اندر داخل ہوا۔ اس کی متجسس نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نظریں کمرے میں رکھے ایک بڑے صندوق پر رک گئیں۔ بجلی کی طرح جھپٹ کر راجہ نے صندوق کا پٹ اٹھایا۔ اوندھے پڑے گنہگار کو بالوں سے پکڑ کر راجہ نے باہر گھسیٹا اور اپنے شکاری کتوں کی زنجیر چھوڑ دی۔ صبح سے بھوکے رکھے گئے یہ خوفناک کتے آن واحد میں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے۔

"نہیں نہیں۔" چھوٹی رانی پاگلوں کی طرح کتوں پر جھپٹی۔ مگر بیچ ہی میں راجہ کے مضبوط ہاتھوں نے اسے روک لیا اور وہ ان مضبوط ہاتھوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی۔

صبح ریاست میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ رات چھوٹی رانی کو سانپ نے ڈس لیا۔ ارتھی کے ساتھ خود راجہ صاحب ننگے سر تھے۔ صرف قلعے کی دو وفادار کنیزیں یہ جانتی تھیں کہ جب وہ اپنی بدنصیب رانی کو سویرے اٹھانے گئیں تو اس کے کمرے میں خون اور ہڈیوں کے بچے کچھے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے اور رانی دلہن کی طرح سجی اپنی مسہری پر پڑی تھی۔ مسہری کے نیچے چھوٹے ہوئے ہاتھ کی انگوٹھی سے وہ بڑا اور قیمتی ہیرا غائب تھا جسے وہ ہمیشہ پہنے رہا کرتی تھیں۔



بھارت ایک مُرقّع ہے
مذہبوں کا،
تہذیبوں کا،
زبانوں اور پہناووں کا،

رسموں اور رواجوں کا،
روایتوں اور جدّتوں کا،
آدرشوں اور اُمنگوں کا،
کاوشوں اور کامیابیوں کا۔



بے مثال رنگارنگی
لازوال یکجہتی

بھارت ایک گلدستہ ہے
جس میں آراستہ
بھانت بھانت کے پھول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دِلوں کو لبھاتے ہیں،
دماغوں کو معطر بناتے ہیں۔

davp 73/125

مہندر ناتھ

میرے زخم

دراصل میں تو خود حیران تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اُرملا کو دیکھنے کے بعد میری آواز کیوں حلق میں اٹک جاتی ہے۔ جو کچھ وہ کہتی ہے اسے کرنے پر میں کیوں مجبور ہو جاتا ہوں۔ اُرملا کو میرے گھر آئے ہوئے صرف چند دن ہوئے تھے۔ وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ آئی تھی۔ اگر میں اپنے خد و خال کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دوں تو مجھے سمجھنے میں آپ کو بہت آسانی ہو گی۔ میری صورت دیکھ کر آپ کبھی خوش نہ ہوں گے۔ یعنی اچھا خاصا بدصورت آدمی ہوں۔ یوں میرے بتیس دانت اپنی جگہ پر ہیں۔ ناک ذرا لمبی اور نوک دار ہے۔ لیکن اتنی لمبی اور نوکیلی نہیں کہ آپ میرا مذاق اڑاتے پھریں۔ آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی۔ چہرہ لمبوترا، رنگ ذرا سیاہ سا۔ ماتھا چھوٹا اور بال کالے کم سفید زیادہ۔ یوں میری عمر زیادہ نہیں ہے بلکہ اسے خاندانی بیماری سمجھئے کہ میرے بال کم عمر میں ہی سفید ہو گئے۔ یوں چہرے کو دیکھ کر آپ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میرا چہرہ خوشگوار اثر نہیں ڈالتا۔ یوں میرا قد لانبا اور میرا اچھا خاصا ڈیل

ڈول ہے ۔ بھاری آواز ۔ پھر بھی کیا عرض کروں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بات نہیں بنتی ۔

اس بات کا مجھے علم ہے کہ میرے پیدا ہوتے ہی میری ماں مرگئی تھی ۔ اور میرے باپ نے دوسری شادی کرلی ۔ میرا باپ ایک حولدار تھا ۔ اسے سوائے حکم چلانے کے اور کچھ نہ آتا تھا ۔ بچپن میں اس نے مجھے خوب مارا ۔ اس لئے میں پانچویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکا ۔ جب میں جوان ہوا تو سارے علاقہ میں اچھا خاصا آوارہ گرد مشہور ہو چکا تھا ۔

چند لوگ اچھے کام کرکے مقبول اور مشہور ہو جاتے ہیں ۔ میں نے برے [illegible] کے شہرت حاصل کرلی تھی ۔ یہ بات تو نہیں کہ میں شرابی کبابی یا جواری تھا ۔ بس کام نہ کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ بہت کوشش کرنے پر بھی یہ عادت مجھ سے چھوٹ نہ سکی تھی ۔ ذاتی مشغلہ یہ رہ گیا کہ یار دوستوں سے یا تو گپیں ہانکنا ۔ چار مینار کے مسلسل سگریٹ پینا ، گھٹیا افسانے اور ناول پڑھنا ، نت نئی فلمیں دیکھنا اور اگر ان سے مہلت ملتی تو ایک ہلکی پھلکی کہانی گھسیٹ لینا ۔ ایک اور بری عادت پڑ گئی تھی ، جسے کہتے ہوئے شرم آتی ہے یعنی جب میں کسی خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا ۔ حتیٰ کہ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور میں خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ۔

میری بدصورتی مجھ پر اس قدر غالب تھی کہ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے مسکرا کر بات تک نہ کی ۔ اکثر لڑکیاں مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں ۔ یوں میں مرنجاں مرنج قسم کا آدمی نہیں ہوں ۔ اپنا کام نکالنا جانتا ہوں ۔ کافی بیباک اور اکھڑ

ہوں۔ جب تک لوگ میری مدد کرتے ہیں، میں ان کی طرفداری کرتا ہوں، جوں ہی وہ مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں میں بھی ان سے منہ پھیر لیتا ہوں۔ کبھی ملاقات ہو جائے تو ان کی اچھی خاصی خبر لیتا ہوں۔ چھوٹے بھائیوں سے روپے ادھار لے کر انہیں کبھی واپس نہیں کرتا۔ اپنے گھٹیا پن کا مجھے احساس ہے۔ کیا کروں زندگی کی گاڑی اس گھٹیا پن کے بغیر نہیں چلتی اور اس وجہ سے لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُرملا نے میری طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں اُرملا بھی لڑکی۔ ایسی لڑکی نہیں کہ انسان دیکھتے ہی اس پر فدا ہو جائے۔ میری طرح وہ بھی اچھی خاصی بدصورت تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میرے چہرے پر وہ اعضا تھے جو ایک خوبصورت انسان کے چہرے پر ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ایسا تاثر پیدا کرتے کہ دیکھتے ہی گھن آنے لگتی۔ اُرملا کے چہرے کی بھی یہی حالت تھی۔ اُرملا کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ نہ ٹیڑھی نہ بھینگی۔ سر کے بال سیاہ تھے۔ ناک مجھ سے بہتر۔ ہونٹ ذرا موٹے موٹے اور رنگ مجھ سے زیادہ سیاہ چہرا ابھرا ہوا۔ جہاں تک اُرملا کے جسم کا تعلق تھا اس میں نسوانی دل کشی کی جھلک نمایاں تھی لیکن اگر مجموعی طور پر اُرملا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اچھی خاصی بدصورت لڑکیوں کی صف میں جگہ ملے گی۔

پہلی ملاقات میں اُرملا نے بلا کر کہا — "یہ لو پانچ کا نوٹ اور نلم جنگلی کے دو ٹکٹ لاؤ! جلدی۔" ارملا کے انداز بیان میں

کوئی نسائیت نہ تھی بلکہ بات کہنے کا ڈھنگ تھلرانہ تھا جو مجھے ناگوار لگا
میں اس وقت خاموش رہا۔ اگر اس طریقہ سے میرا کوئی ساتھی مجھ سے
ہم کلام ہوتا تو پانچ روپے کا نوٹ اس کے منہ پر دے مارتا۔ میں نے
سوچا کسی لڑکی کی اس طرح بے عزتی کرنا شرافت نہیں حماقت ہوگی۔
میں نے ٹکٹ خرید کر ارملا کو دے دیئے۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا
بس ٹکٹ مجھ سے چھین لیے۔ کیا میں ارملا کا زرخرید غلام تھا۔ کیا
سمجھتی ہے وہ اپنے آپ کو۔ شائد وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس قسم
کا آدمی ہوں۔ اجی جس نے اپنوں سے بگاڑ لی وہ دوسروں کی کیا پروا
کرے گا۔

اگلے دن وہ کہنے لگی۔ "ذرا ماچس لائیے بازار سے"۔ اور
میں ماچس لے آیا۔ پھر کہنے لگی "چائے کا پیکیٹ"، وہ بھی لے آیا۔
پھر سوئی اور دھاگے کی فرمائش کر دی۔ ایک دن تو غضب کر دیا
ارملا نے۔ کہنے لگی۔ "وہ سلیپر اٹھا کر لائیے"۔ کوئی اور ہوتا تو سلیپر
اٹھا کر منہ پر مارتا۔ میں نے خاموشی سے سلیپر اٹھا کر اس کے پاؤں کے پاس
رکھ دیئے۔ میری خودداری اور غیرت کہاں گئی تھی۔ شرم سے میرا سر جھک
گیا۔ میں نے بے شرمی کا لبادہ کیوں اوڑھ لیا۔ میں ارملا سے صاف صاف
کیوں نہیں کہہ دیتا کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ اتنے گھٹیا کام مجھ سے کیوں
کرواتی ہو۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے
کہ میں ایسے گھٹیا کام کرتا ہی کیوں ہوں۔

ارملا دس دن تک میرے گھر میں رہی اور دس دنوں تک

مجھ پر ایک ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتی رہی اور میں ایک غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔ گیارہویں دن جب وہ جانے لگی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی رعونت اور اکھڑپن تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قسم کی نرمی نہ تھی۔ نہ شفقت، نہ پیار اور نہ ہی محبت کی ایسی خوشبو جس سے میرا دماغ معطر ہو جاتا۔ وہ آنکھیں اصرار کے انداز سے کہہ رہی تھیں "جہاں میں جارہی ہوں تمہیں آنا پڑے گا" عجیب معشوقہ سے پالا پڑا ہے۔ خالص ڈکٹیٹر ہے۔ کم بخت۔ میں دو سال تک اپنے گاؤں میں بھٹکتا رہا۔ تاکہ اُرملا کو بھلا سکوں۔

ارملا نے مجھے کیا دیا تھا کہ میں اسے یاد کرتا۔ بس نوکروں کی طرح کام لیتی رہی۔ وہ کون سی کافرادا حسینہ تھی کہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ مجھے غصّہ تو اس بات کا تھا کہ میں غلاموں کی طرح اس کے حکم بجالاتا رہا۔ آخر کیوں ــــ دو سال تک میں اور کوئی کام نہ کر سکا۔ بس اُرملا کے خلاف ایک محاذ بناتا رہا۔ مل جائے تو اس سے بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہو گیا۔ یہ کس قسم کی نفرت تھی مجھے ارملا سے ...... اور کیوں؟ ...... میں ارملا کو بھول کیوں نہیں جاتا ــــ اس ذہنی انتشار سے مجھے کیا ملے گا؟ اسے بے عزت کر کے مجھے کون سا تمغہ ملنے والا ہے۔ اُرملا کا بدصورت چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتا۔ پھولے ہوئے نتھنے۔ سیاہ چہرے پر موٹے موٹے ہونٹ۔ بیکار سی رعونت، طرزِ تکلم ہٹلرانہ، کیا یہ نفرت کا لاوا محبت کو جنم دے رہا تھا۔ کیا نفرت کی کوکھ سے محبت پیدا ہوتی ہے

میں پہلے ہی بے کار تھا۔ ارملا کی محبت نے اور بے کار کر دیا۔ میں چڑ چڑا سا ہو گیا۔ بات بات پر یار دوستوں سے لڑ پڑتا۔ جو لوگ میرے ہمدرد تھے۔ ان سے بھی جھگڑا کرتا اور جب اس گاؤں میں بالکل اکیلا رہ گیا تو میں نے اُرملا کے شہر کی طرف رخ کیا تاکہ میری روح کی تشنگی مٹ سکے۔

میں بمبئی آ گیا، جہاں اُرملا اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ پیشانی پر فتح مندی کے آثار نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی۔ "مجھے یقین تھا تم آؤ گے۔"

یہ میری زندگی کا بدترین دور تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ ایک بھکاری کی طرح اس شہر میں گذار دیا۔ پانچویں جماعت پاس انسان بھلا اس شہر میں کیا کر سکتا تھا۔ بس تھوڑی سی ہندی آتی تھی اور ٹوٹی پھوٹی انگلش۔ کام کاج کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر نتیجہ صفر نکلا۔ ایک وقت کا کھانا کے سوا تاپس انھیں دنوں ارملا میرے کام آئی۔ وہ اکثر مجھ پر ترس کھا کے ایک دو روپے دے دیتی۔ کبھی کبھی میرے کپڑے دھوتی قمیص یا پاجامہ پھٹ جاتا تو فوراً اسے سی دیتی اور مہینے میں ایک دو فلمیں بھی دکھا دیتی۔ اور ہمیشہ مجھ سے کہتی۔ "کوئی کام کرو۔" جب کوئی کام نہ ملا تو میں نے دادر پوسٹ آفس کے باہر منی آرڈر لکھنے کا کام شروع کیا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہو کر لوگوں کے منی آرڈر لکھتا۔ برسات میں جب بارش ہوتی تو پوسٹ آفس کی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا اور منی آرڈر لکھتا۔ سب کیسے دن تھے۔ یہ کیسی راتیں تھیں۔ یہاں تو کوئی کسی کا نہ تھا بس ایک ارملا تھی جو وقت بے وقت دو میٹھے بول بول لیتی۔ اب تو حکم نہ ماننے کی بھی

ہمت مجھ میں نہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ارملا کے ظاہری خول میں ایک تکبر، رعونت اور غرور ضرور تھا لیکن اس کے دل کے اندر میرے لیے کافی جگہ تھی۔ اگر وہ مجھ سے ہمدردی نہ کرتی تو وہ میرے کپڑے ہرگز نہ دھوتی، ان پر استری بھی نہ کرتی۔ میرے پھٹے ہوئے کپڑوں کو اسے سینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "کہیں نوکری کر لو" جب وہ نوکری کی بات کرتی تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ نہ جانے میرا جی ایک جگہ جم کر کام کرنے کو کیوں نہیں چاہتا تھا۔ اگر مجھے نوکری مل جائے تو میں ایک کمرہ کرایہ پر لے سکتا ہوں۔ ارملا میرے پاس رہ سکتی ہے۔ جو کچھ میں کماتا اس سے دو وقت کا ہی کھا سکتا تھا۔

ارملا کے بھائی کو ہم دونوں کی ملاقاتوں کا پتہ چل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ اپنی بہن پر ایسا برسا کہ ناکوں چنے چبوا دیئے۔ ایک رات ارملا کو اتنا پیٹا کہ وہ سات دنوں تک گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بھائی نے بہن سے صاف صاف کہہ دیا۔ "اگر تم نے اس ناخلف، بے شرم، آوارہ اور بے کار انسان سے بات کی تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کردوں گا۔ اور اگر کبھی وہ یہاں آیا تو اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی۔"

جب مجھے اس مارپیٹ کی خبر ملی تو بے حد رنج ہوا۔ میں کتنا بے کار نستم کا انسان ہوں کہ ارملا کو اپنانے کے لئے کچھ کرتا نہیں۔ چند دنوں بعد پتہ چلا کہ ارملا کی سگائی ہونے والی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اب میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے کہوں اپنے دل کی واردات۔ میری کون دیکھ بھال کرے گا۔

اس دنیا میں آرملا کے سوا میرا اور کون تھا۔ مجھے ایک وقت پہلے روز کون دے گا۔ میرے میلے کپڑے کون دھوئے گا۔ میرے پھٹے کپڑوں کو کون سیئے گا، مجھے ڈھارس کون دے گا۔ مجھ سے کون کہے گا کہ "تم نوکر کیوں نہیں ہو جاتے ؟" مجھ سے کون بات کرے گا ؟۔ اب میں کہیں کا نہ رہا۔ آرملا کے بغیر میری زندگی بیکار تھی۔ میں آرملا سے ضرور ملوں گا۔ اور کہوں گا۔ اگر تم نے کسی اور سے شادی کر لی تو میں بالکل بے سہارا ہو جاؤں گا۔ میں آرملا کے گھر کی طرف چل دیا۔ آج اگر آرملا کے گھر سے میری لاش نکلتی ہے تو نکلے، اس کا بھائی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو قتل کرے۔ اب تو مرنا ہی بہتر ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس قسم کی شام زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ جونہی ارملا کے گھر کے قریب پہونچا کہ سامنے سے ارملا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب سے گذری۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ بازار سے نکل کر ہم دونوں ایک جنگلے کے قریب آ گئے۔ جنگلے کے ساتھ ریل کی پٹری تھی۔

"جانتے ہو میری سگائی ہو رہی ہے ؟"

"ہاں !"

"اب تو میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ملنے سے کیا فائدہ ؟"

"یہ فیصلہ تمہارے بھائی نے کیا ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

میں نے چار مینار کا پیکٹ جیب سے نکالا اور ایک سگریٹ سلگا یا۔

"آٹھ سال سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک راستے پر چلے جا رہے ہو"

"اور وہ راستہ تمہارے گھر کی طرف جاتا ہے۔" میں نے زور سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ راستہ اب بند ہو چکا ہے۔ مجھے اب شادی کرنی ہوگی۔ میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں۔"

میں نے غصے میں آ کر جلتے ہوئے سگریٹ کو بائیں طرف کی ہتھیلی سے رگڑ کے بجھا یا۔ اُرملا نے جلتے ہوئے سگریٹ کو بجھتے ہوئے دیکھا میرے بائیں ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔

"میں نے سوچا تھا ان آٹھ برسوں میں تم کچھ کر لوگے؟"

"اور میں کچھ نہ کر سکا۔"

"میں نے چاہا تھا کہ تم کہیں نوکر ہو جاؤ ـــــ ایک کمرہ لے لو پھر میں اپنے بھائی سے......"

"میں ایک کمرہ بھی نہ لے سکا۔"

میں نے دوسرا سگریٹ ہتھیلی پر بجھاتے ہوئے کہا۔ دو زخم ہو گئے تھے میرے ہاتھ کی جلد جل رہی تھی۔

"میں نے یوں بھی سوچا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گے اور گھر واپس چلے جاؤ گے۔"

"اور میں تمہیں آج تک نہ بھلا سکا۔" میں نے تیسری سگریٹ

کو ہتھیلی کی بیک پر بجھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا تم خودکشی کر لو گے۔"

میں نے اپنا جو تھا اور بایاں سگریٹ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔ پانچ جلتے ہوئے نشان میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ایک اور سگریٹ سلگایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ چلا کر بولی۔ کیوں جلا رہے ہو اپنے آپ کو؟"

"تم ہاتھ کی بات کر رہی ہو۔ آج میں اپنے آپ کو جلا دوں گا تمہارے سامنے۔ اب میری راکھ کو سیندور سمجھ کر اپنی مانگ میں بھرنا۔"

اب اُرملا سے نہ رہا گیا۔ میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میرے زخموں کی طرف دیکھا جو جل رہے تھے اور ان جلتے ہوئے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور آہستہ آہستہ ان بے رحم آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور میری تشنہ روح کو سیراب کرنے لگے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہو۔ میں نے اُرملا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ارملا بھی میرے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی۔ منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی سپردگی نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری ہے۔ میرے زخموں کی طرح میری۔

مظہر امام

راستے کی تلاش میں

..... مگر ہم کو اس کی خبر ہی نہیں ہے
کہ جن کے لئے
ہم نے جینے کے انداز سیکھے
وہ انداز کب کی فنا ہو چکی ہیں!

قرینے سے
الماریوں میں سجائی ہوئی
سرد عاقل کتابیں
مجھے طنز سے دیکھتی ہیں

چلو
آؤ
اس راستے پر چلیں
جس کو دن بھر کی دلہن بنا کر
اک آوارہ سورج نے
خانہ بدر کر دیا ہے۔

نازش پرتاب گڈھی

بزدل

سخت نادان ہیں یہ اگلے زمانے والے
جو غمِ زیست کا احساس بڑھا دیتے ہیں
جب بھی ملتے ہیں تو جینے کی دعا دیتے ہیں

میں نے چاہا تو کئی بار مگر کہہ نہ سکا
چپکے چپکے غمِ ہستی غمِ دنیا سہہ کر
آج کے دورِ بلاخیز میں زندہ رہ کر
آپ نے جرمِ مسلسل جو کیا ہے اب تک
کیوں اسی جرم کا بچوں کو پتہ دیتے ہیں
کس گنہ پر انھیں یہ سخت سزا دیتے ہیں

اپنے ہر خورد کو جینے کی دعا دی جائے
اب تو یہ رسم زمانے سے اٹھا دی جائے
میں نے چاہا تو کئی بار مگر کہہ نہ سکا
ہائے وہ اشک جو پلکوں پہ رہا بہہ نہ سکا

تحسین سروری

گُریز

کتنے دن بیت گئے، میں نے تجھے چاہا تھا
برق بنکر اُفق روح پہ لہرائی تھی
تو کسی خواب کی جنت سے اُتر آئی تھی
کیا بیاں کیجے، کیا حال دل شیدا تھا

ذرّہ خاک قدم تیرے دمک اٹھے تھے
تیری زلفوں، ترے گلنار بدن کی خوشبو
پھیل جاتی تھی، سمن زار مہک اُٹھتے تھے
دیکھنے والوں کی نظروں سے بچا کر میں نے
کس تمنا سے، محبت سے تجھے دیکھا تھا

اب یہ دن ہیں کہ تجھے دیکھ بھی لیتا ہوں اگر
بھول جاتا ہوں تجھے میں نے کبھی چاہا تھا

ممتاز رحیم

محرومی

آج بھی یوں ہی شب تار گذر جائے گی
آج بھی آنکھوں کے بے خواب شبستانوں میں
حسب معمول پھر اشکوں سے چراغاں ہوگا

آج بھی یوں ہی شب تار گذر جائے گی
آج بھی دل میں کسی پیکر رعنا کا خیال
مثل مہتاب سرِ بام درخشاں ہوگا

آج بھی لب پہ مچلتا ہوا مبہم سا سوال
زینت بے کار امیدوں پہ کئے گی کب تک
درد بن کر دل مضطر میں خراماں ہوگا

دھیان کی جھیل میں بیٹھی ہوئی یادوں کا ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعل غم نکلے گا
غم جاناں ہی علاج غم دوراں ہوگا

★

ظفر اقبال

وہ آئے گا

شکر کر تعمیرِ دل کی، وہ یہیں آ جائے گا
بن گیا جس دن مکاں اس دن مکیں آ جائے گا

کون سا ہم روز روز اس کو بلاتے ہیں یہاں
بے مروّت ہے مگر اتنا نہیں آ جائے گا

ہم سے مل لینے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ اب
جو کوئی اس کو بلائے، ہر کہیں آ جائے گا

خود بھی وہ چالاک ہے لیکن اگر ہمت کرو
پہلا پہلا جھوٹ ہے اس کو یقیں آ جائیگا

اب تو جیسے خود بھی آنا چاہتا ہے وہ ظفر
گھر گلی ہوٹل جہاں چاہو وہیں آ جائیگا

★

سطوت رسول

زخمی دریچے

کبھی تو آؤ!

اُداس آنکھوں کی جھیل سوکھے، لہو کا گلنار رنگ چھلکے

وہ چاندنی جو اجاڑ صحرا کی سمت پھیلی ہوئی ہے

ہر ایک دشت دور کی جانب، نگاہ حسرت سے تاکتی ہے

شکست کھاتی ہوئی فصیلیں کھڑی ہیں ہر ایک راہ روکے

کوئی تو آئے پناہ لینے

گلیم اوڑھے پرانے قصبوں کی، گاؤں کی کہانی کہنے

وہ بوڑھا برگد جٹائیں کھولے

ہزاروں لمحوں کے وقت کی بات کہہ رہا ہے

جو مجھ میں ہے، وہ آج مر رہا ہے

وہ میرا کمرہ سسک رہا ہے

میں لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں

طویل راتوں کی گرد اب تک بکھری نہیں ہے

میں اپنی آنکھوں کو بند کر کے

یہ سوچتا ہوں، خلا کا گہرا البسیط سایہ ناچتا ہے

اندھیرا بڑھتا ہے اور بڑھتا ہی جا رہا ہے

سکوت کتنا اتھاہ، آواز بھی نہیں ہے

کوئی دمساز بھی نہیں ہے۔!

مصطفےٰ زیدی

آدمی

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے

میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا
اہلِ ایقان کا حامی ، نہ گنہ گاروں کا
نہ خلاؤں کا طلب گار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے

اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا
رات کا روپ بھی بیزار چراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا شامِ غریباں بھی خفا
دزدِ ایماں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن دہر کے ادراک میں ہے
جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے



حمایت علی شاعر

جواب

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اسے دیکھنے لگا



سلیمان خمار

مشورہ

تو اب کیجئے —
اک ایک سورج کو جلا دیجئے
سمندر کی سیہ آنکھوں میں خنجر گھونپ دیجئے
گرجتے آبشاروں کے گلے میں
خامشی کا کالا پھندہ ڈالیے
زمیں کے پیٹ میں پکتے ہوئے لاوے کو زخمی کیجئے
خلائیں تیر سے
نیلے زہریلے دھوئیں کے پاؤں میں زنجیر پہنا دیجئے
وقت کے پھنکارتے ناگوں کو
دانتوں سے دبا کر تھوک دیجئے۔
— تو ہو سکتا ہے جینے کی کوئی صورت نکل آئے



اعجاز صدیقی

فرقت کاکوروی مرحوم
چند یادیں

مجھے جس بات کا اندیشہ تھا۔ بالآخر وہ ہو کر رہی۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نے عالمِ غربت اور انتہائی کس مپرسی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایسی المناک اور پُراسرار موت کہ میں آج تک اسی سوچ اور ایک ایسے عجیب رنج و اندوہ میں مبتلا ہوں جو عزیزوں اور دوستوں کی موت کے عام غم سے کچھ مختلف اور ماورائی قسم کا ہے۔ میں نے اپنے بہت سے خوابوں اور اندیشوں کو اسی شکل میں پورا ہوتا ہوا دیکھا ہے جس طرح وہ کبھی لاشعور میں پیدا ہوئے۔ شاید یہ میرے تجزیے، تجربے، نفسیاتی مطالعہ و مشاہدہ اور حساس دل کا نتیجہ ہو۔ جو کچھ بھی ہو ___ فرقت کاکوروی کی موت دل ہلا دینے والی ہے۔ خدا گواہ کہ میں لرز کر رہ گیا اور وہ میرے نفرت کے جذبات جو جدید دور کے معاشرے، سماج نظام حکومت اور غلط بخشیوں کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ مضطرب و متألم رکھتے ہیں کچھ اور بھڑک اٹھے۔ ۱۲ر جنوری ۷۳ء کو فرقت جبریا

کے مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے۔ شب میں مغل سرائے کے اسٹیشن ماسٹر نے پولیس کو اطلاع دی کہ سیالدہ ایکسپریس کے تیسرے درجے میں ایک لاش ملی ہے جامہ تلاشی پر ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ دہلی اطلاع دی گئی اور قبل اس کے کہ دہلی سے فرقت مرحوم کے عزیز و احباب پہونچیں، ان کی لاش بنارس کی کسی مسلم انجمن کو دے دی گئی۔ اور اس نے اپنے کارِ ثواب سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سوچے سمجھے بغیر سپردِ خاک کر دیا۔ شرعی مجبوری یہ کہ لاش کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ لے جایا بھی نہیں جاسکتا ——— ہائے۔ یہ ہمارے ملک کی پولیس یہ لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین کرنے یا جلانے والے ادارے۔ کوئی دوسرا ملک ہوتا تو چند منٹ ہی میں مرنے والے کے لواحقین کا پولیس سے رابطہ قائم ہو جاتا جس کا ذہ ہوتا۔ اور یہ جاننے کے بعد کہ اس کی شخصیت کیا ہے اس کی لاش حکومت کے خرچ سے ورثا کو بھیج دی جاتی۔ یہی نہیں موت کی پوری پوری تحقیقات بھی کی جاتی۔ آخر یہ ڈائریاں یہ شناختی کارڈ (IDENTITY CARD) بستروں اور سوٹ کیسوں پر نام اور پتے کس لئے ہوتے ہیں؟

کیا ایک ممتاز ادیب و شاعر کی اس المناک موت پر صدائے احتجاج بلند کی گئی؟ پولیس سے باز پرس ہوئی؟ ملکی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر جاگے؟ ماہرینِ سازِ موسیقی، فلم کے آرٹسٹوں اور مختلف کھیلوں کے کھلاڑیوں کے لئے بے شمار سہولتیں، بے اندازہ انعام و اکرامات۔ یہ ہوائی جہازوں میں سفر کریں اور ادیبوں شاعروں، معلموں کو تیسرے درجے میں بھی مشکل جگہ ملے۔ ان کی موتیں اس طرح واقع ہوں۔ یہ معاشی بدحالی کے شکار رہیں۔ یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں ——— ؟!!

غلام احمد فرقتؔ کی موت کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ان پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہوگا اور سانس گھٹ گئی ہوگی۔ یا پھر سردی کی شدت سے ان کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ مگر ٹرین میں وہ تنہا تو نہ ہوں گے۔ وہ بھی تیسرے درجے میں۔ کیا کسی نے ان کو تڑپتا اور کراہتا ہوا نہ دیکھا ہوگا؟ کیا ایک سوئے اور مرے ہوئے انسان کو تنہا چھوڑ کر سارے مسافر ڈبے سے اتر گئے ہوں گے۔ کیا ہندوستانی ریلوں میں سفر کرنے والے اتنے کٹھور ہوتے ہیں —— چھبریا سے روانگی کے وقت ان کی حالت کیا تھی۔ کس نے انھیں سوار کرایا تھا۔ مرحوم کے پاس کیا سامان سفر تھا اور سردی سے مدافعت کے لئے کتنے کپڑے تھے؟

فرقتؔ مرحوم کے ساتھ کئی بار موسم گرما اور موسم سرما میں سفر کا اتفاق ہوا۔ بڑا ہی مختصر سامان سفر ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں ایک بار وہ میرے ساتھ سری نگر گئے اور ایک بار دھرم شالہ دونوں بلند پہاڑی مقامات۔ شب میں کڑاکے کی سردی مگر ان کے پاس وہی ایک کمبل یا چادر، معمولی سا سویٹر اور کوٹ، ایک پرانا سا مفلر۔ میں جب ساتھ ہوتا تھا تو وہ بہت مطمئن رہتے تھے۔ دھرم شالہ کے مشاعرہ میں مولانا علیم اختر (مرحوم) اور میں نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ شاعرہ میں انھیں گرم چادر اڑھا کر لے گئے۔ سری نگر میں ہم دونوں علی جواد زیدی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ دوسرے تمام شعراء ٹورسٹ بلڈنگ میں زیدی صاحب سے فرقتؔ کے تعلقات بے حد بے تکلفانہ اور گھر کے سے تھے۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ مگر چلتے وقت جب بانہال کے درّے سے ادھر بس رک

گئی تھی۔ اور رات ڈاک بنگلہ میں گذارنی پڑی تھی تو مجھے انھیں سردی سے بچانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ پان بکثرت کھاتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ پانوں کی پڑیا رہتی تھی۔ میرے ساتھ ہوتے تو میرا سفری پاندان، میرا اٹیچی، اور بٹوہ ان کے قبضہ میں رہتا۔ پان اگر ختم ہو جائیں تو کہتے ہ "اب موت واقع ہونے والی ہے"۔ پان سے ان کا منہ ہمیشہ بھرا رہتا۔ بات کرتے تو چھینٹیں اڑتیں۔

ضیق النفس (دمہ) کے مریض تھے۔ رات کو سو نہیں سکتے تھے کبھی بیٹھے بیٹھے اونگھ لئے، یا ایک آدھ خرّاٹا لے لیا۔ بس ان کے ساتھ ٹھہرنا قیامت ہوتا تھا۔ بے حد باتیں کرتے تھے اور بہت جلدی جلدی ــ گرمی ہو یا سخت سردی، زمین ہو یا پہاڑ، ٹرین ہو یا گھر، وہ صبح چار پانچ بجے سرد پانی سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ نہاتے تھے اور اس عمل سے رتجگا کے اضمحلال کو دور کر لیا کرتے تھے۔ بالوں کو مہندی یا خضاب سے رنگتے تھے۔ سانس کی تکلیف کی وجہ سے بہت زور سے بولنے کے عادی تھے۔ مگر لہجہ برداشتہ و رفتہ تھا۔ "اماں" تکیہ کلام تھا۔ مجھ سے سال دو سال چھوٹے تھے۔ عموماً آپ ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ دہلی سے دھرم شالہ جاتے ہوئے میرے ساتھ ہی تھے۔ ٹرین کی روانگی سے پہلے اندھیرے میں میرا سوٹ کیس غائب ہو گیا۔ اور جب بڑی پریشانی اور بھاگ دوڑ کے بعد وہ ایک دوسرے مسافر کے سامان میں ملا تو میں اور فرقت اسے اپنی برتھ تک لائے۔ ابھی سوٹ کیس اوپر برتھ پر رکھا بھی نہ تھا کہ بولے۔

"اماں پان کھلاؤ۔"

۱۹۶۶ء میں ادے پور میں کل ہند اردو سیمپوزیم اور مشاعرہ ہوا تھا۔ دونوں کی صدارت کا بار مجھ پر ڈالا گیا تھا۔ بمبئی سے ندا فاضلی میرے ساتھ گئے تھے۔ دہلی سے نریش کمار شاد، شہاب جعفری اور فرقت کاکوروی، بھوپال سے شفا گوالیاری، راجستھان کے بھی کئی ممتاز شاعر اور ادیب آئے تھے۔ ندا فاضلی نے اس سیمپوزیم اور مشاعرہ پر ایک "رپورتاژ" لکھا تھا ـــــ وہ لکھتے ہیں۔

(۷½ بجے شام کو سیمپوزیم کے افتتاح کے وقت) ..... "کسی نے پیچھے سے کہا، فرقت کاکوروی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ فرقت صاحب میرے پیچھے ہی جوتوں کے پاس کسی تکلف کے بغیر آکر بیٹھ گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، منہ میں پانوں کی پندرہ بیس گلوریاں، چہرہ پر کئی سال کی لگاتار جگاروں کی تھکن اور سر پر بکھرے چھوٹے چھوٹے بال۔"

"دوسرا دن کافی مصروف گزرا۔ دو مقامات کی نشستیں، پھر رات کو آل انڈیا مشاعرہ۔ فرقت کاکوروی نہائے دھوئے ـــــ معصوم اور اچھے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا مضمون پڑھا۔ اور تمام محفل کو قہقہوں سے لوٹ پوٹ کر دیا، ایک تو موضوع ہی خود دلدار قہقہہ تھا، اس پر پڑھنے کا ان کا ڈرامائی انداز، ابوالکلام آزاد اپنی بھتیجی اندرا کا ندھی کو عالم بالا سے خط لکھ رہے ہیں۔ بات میں بات نکالنا اور لفظوں اور جملوں کے گھماؤ پھراؤ سے مزاح پیدا کرنا فرقت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" (سیمپوزیم)

"فرقت کاکوروی اپنا نام سنتے ہی کھڑے نہیں ہوتے۔ اپنے

بارے میں کہے گئے ایک ایک لفظ کو مسکراتے ہوئے سنتے رہتے ہیں۔۔۔۔
فرقت صاحب نے بڑے جاندار سماجی موضوع پر نظم شروع کی ہے۔
"برتھ کنٹرول"۔ سامعین زبان کی صفائی، سماجی طنز اور شوخ بیانی
کی داد دیتے دیتے بے قابو ہوتے جا رہے ہیں"۔

"مشاعرے کے بعد۔ "جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات"۔ والی
صورت بن گئی۔ میں، شہاب جعفری، عابد حسین ادیب۔ فضل المتین اور
خلیل تنویر تکلفاً اس انتظار میں کہ فرقت صاحب جو لطیفہ سنا رہے ہیں
وہ ختم ہو تو محفل برخاست کی جائے۔ مگر لطیفہ تھا کہ شیطان کی آنت۔
بات میں بات، جملہ میں جملہ۔ میں دیوار سے ٹیکے ٹیکے ہی غائب ہو گیا۔۔ کافی
دیر بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سامعین کی اکثریت شکست خوردہ فوج کی
طرح گردنیں ڈالے پڑی ہے اور اکیلے فرقت صاحب اپنی تیغ گفتار
لئے بے چارے شہاب جعفری پر لگاتار حملے کئے جا رہے ہیں"۔

فرقت مرحوم بڑے زود گو تھے۔ "برتھ کنٹرول" نظم وہیں۔
اودے پور میں کہی تھی۔ اور سیمپوزیم کے لئے مقالہ بھی وہیں لکھا تھا۔
سفر میں اگر کچھ تازہ کہتے تو سنا دیتے تھے اور کوئی بات نکالنے کے
لئے کہتا تو ترمیم بھی کر لیا کرتے تھے۔ ان سے تعلق رکھنے والوں میں یہ حق
صرف شمیم کرہانی، علی جواد زیدی اور مجھے حاصل تھا۔ دہلی جاتا تو
کبھی کبھی شب کو وہ میری قیام گاہ (مولانا علیم اختر کا مکان) پر آجایا
کرتے تھے۔ بمبئی آتے تو مکتبہ جامعہ اور غریب خانہ ان کی جولان گاہ
ہوتے۔ ۱۹۶۹ء میں "شاعر" کے غالب نمبر کے طنز و مزاح کے

باب کے لئے میں نے مضمون ان سے مانگا تھا۔ اور انھوں نے ایک ایسا مضمون بھیجا تھا جسے غالب نمبر میں شائع کرنا مناسب نہ تھا۔ اس لئے مدتوں کی دوستی میں ذرا سا بال پڑ گیا تھا۔ خط و کتابت بند رہی۔ میں نے "شاعر" بھی بند کر دیا تھا۔ برادرم شمیم کرہانی کے ذریعہ ان کی خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا۔ اور اسی ذریعہ سے انھیں چھیڑتا بھی رہتا تھا۔ مگر اس دوران میں جب بھی ملاقات ہو گی۔ ان کی بلند ظرفی کہ کبھی بھی شکایت نہ کی۔ اسی طرح کھل کر اور ٹوٹ کر ملتے رہے۔ (ان کے ساتھ دھرم شالہ کا سفر اسی قطع تعلق کے بعد ہوا تھا) ان کی چند منظومات میں ذم اور عریانی کے پہلوؤں سے بھی مجھے اختلاف تھا اور میں نے ان کو صاف صاف لکھ دیا تھا۔ ترقی پسندی کے سلسلے میں بھی ان کے خیالات و نظریات مجھے پسند نہ تھے۔ "قند مکرر" کے نام پر بھی میں نے اعتراض کیا تھا۔

فرحت مرحوم نہایت عاقل و فاضل لوگوں میں سے تھے۔ تاریخ اور اردو میں ایم اے کیا تھا۔ علی گڑھ کے بی ایڈ تھے۔ ان ڈگریوں سے قطع نظر زبان اور فن کے نکات کو خوب سمجھتے تھے۔ زبان اور محاوروں میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ عربک کالج میں استاد تھے اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔
فرحت مرحوم نے پیروڈی میں بڑا نام پیدا کیا۔ شوکت تھانوی ہی کی طرح مزاحیہ انداز میں نظم و نثر وہ لکھتے تھے۔ وہ کئی نظم و نثر کی کتابوں کے مصنف اور اردو کی مقبول شخصیت تھے۔ وہ دیکھنے میں تو مرنجان و مرنج تھے مگر ان کے اندر ایک تیز و طرار اور حساس

انسان چھپا ہوا تھا۔ چشمہ کے اندر ان کی گھومتی ہوئی آنکھیں بڑی جلدی کسی بھی بات کی تہہ تک پہونچ جاتی تھیں۔ افسوس کہ ہم سے ایک ممتاز شخصیت چھن گئی۔ اور وہ بھی بڑے ڈرامائی انداز میں۔

فرقت مرحوم کی نظم و نثر پر کام ہونا چاہئے اور ان کی تصانیف کی اشاعت برابر ہوتی رہنی چاہئے تاکہ ان کے پسماندگان کی کچھ کفالت ہوسکے۔



حفیظ بلوسی ایم اے

مشاعرہ

مشاعرہ کی تاریخ پیدائش کیا ہے، اس کا مولد و مسکن کہاں ہے۔ شاعر پہلے پیدا ہوا یا مشاعرہ، ان باتوں سے مجھے بحث نہیں، یہ کام تو دراصل ان لوگوں کا ہے جو تحقیق کے "گورکن" یا تاریخ کے مجاور ہیں۔ میں ان کا پیدائشی حق چھیننا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک تو یہ ایک شئے لطیف ہے۔ جو اپنی شکل و صورت میں لفظ مباحثہ و مناظرہ سے مشابہ ہے مگر اپنی سیرت معنی و تاثر کے لحاظ سے قطعی مختلف۔ مباحثہ اور مناظرہ کا تعلق اختلاف و انتشار سے ہے۔ اور اس کا انجام لبا اوقات منافرت و مخاصمت پر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مشاعرہ ایک ہر دل عزیز شے ہے اور اس کا رشتہ اتحاد و اتفاق سے ہے اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے۔ یعنی محبت یک جہتی و یگانگت پر۔

میری نظر میں یہی شے ہے جسے کم خرچ بالانشین کہہ سکتے ہیں۔ ہرے لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا۔ آپ کم سے کم پیسوں میں بلکہ

بغیر کسی صرفہ کے زیادہ سے زیادہ خوش وقت ہو سکتے ہیں۔ میوزک کانفرنسں نہ کیجئے محفل مشاعرہ منعقد کر لیجئے۔ محفل قوالی میں نہ جایئے بزم مشاعرہ میں ہو لیجئے۔ (VARIETY ENTERTAINMENT) کے پروگرام میں نہ جایئے۔ مشاعرہ میں شرکت کیجئے۔ یقین کیجئے کہ آپ کے لطف میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ بلکہ آپ کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہوں گے۔

انقلابات زمانہ کے ہاتھوں جہاں اور چیزیں تغیر پذیر ہوئی ہیں وہاں مشاعرہ کے رنگ و آہنگ میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے مشاعرے اپنے بہت سارے آداب و قیود رکھتے تھے۔ صرف خاص خاص موقعوں پر مشاعرہ کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اور ان میں صرف خواص ہی شریک ہو سکتے تھے۔ وہ حضرات جو شاعری کا ذوق سلیم رکھتے تھے اور سخن فہم ہوتے تھے صرف انھیں کو محفل شعر میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ مگر اس جمہوری دور میں یہ بندشیں ختم ہو چکی ہیں۔ مشاعرہ کا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کھلا ہوا ہے۔ آپ شعر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا نہیں۔ مشاعرہ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اب مشاعرے کا رشتہ خواص سے زیادہ عوام سے ہے۔ اس کے انعقاد کے لئے اب نہ بادشاہوں کی محفل کی ضرورت ہے، نہ امراء کے ایوانوں کی۔ مدرسہ، اسکول، کالج، نمائش گاہ، فٹ بال گراؤنڈ، سینما اور تھیٹر ہال آپ جہاں چاہیں یہ بزم سجا سکتے ہیں کہ:

"ہم جہاں بیٹھ کے پی لیں وہیں میخانہ بنے"

مشاعرہ کے لئے اب کسی خاص موسم کی بھی قید نہیں۔ جب

قید مکانی نہ رہی تو قید زمانی کیوں ہو۔ "ہر موسم ہے پیار کا موسم" کی طرح اب ہر موسم مشاعرہ کا موسم ہے۔ پہلے عموماً جاڑے ہی میں محفل شعر و سخن گرم ہوتی تھی۔ مگر اب تخصیص بھی نہیں۔ ساون کی رم جھم ہو یا مئی جون کے آگ اگلتے ہوئے صبر آزما اور ہوش رُبا دن، مشاعرہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ ؏

"ہم کو ہے پینے سے مطلب کوئی بھی موسم سہی"

مشاعرہ میں شرکت کے لئے اب کسی مخصوص لباس کی بھی ضرورت نہیں۔ شیروانی کی جگہ سوٹ اور ٹائی زیب تن کر سکتے ہیں اور کرتا پائجامہ کی جگہ بش شرٹ اور پینٹ آپ کو پوری آزادی ہے۔ ؏

ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

کسی زمانے میں مشاعرے زبان و ادب کی خدمت کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے مگر اب ان کی حیثیت کچھ اور ہے۔ اب تو ان کا انعقاد محض تفریح طبع یا مالی منفعت کی خاطر ہوتا ہے۔ کسی کے جنم دن پر مشاعرہ ہوتا ہے، کوئی مرتا ہے تو مشاعرہ ہوتا ہے۔ تاشقند یا شملہ سمجھوتہ ہوتا ہے تو مشاعرہ ہوتا ہے۔ کسی کے یہاں شادی یا اور کسی خوشی کی تقریب ہو تو مشاعرہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر بہانے مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔

سال کے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دنوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس میں مشاعرہ نہ ہوتا ہو۔ ورنہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شہر یا گاؤں میں مشاعرہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی دن میں بیک وقت کئی کئی جگہ مشاعرے ہوتے ہیں اور لطف تو یہ ہے کہ کبھی کو کل ہند

مشاعرہ کا نام دیا جاتا ہے خواہ ان میں شرکت کرنے والے شعراء دو
چار شہروں سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں۔

اب سے کچھ دہائیاں قبل مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ شعراء
کی طبع آزمائی کے لئے کوئی مصرع طرح یہ کہہ کر دے دیا جاتا کہ

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے"

شعراء حضرات ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ خوب خوب شعر نکالتے
تھے مگر اب طرحی مشاعرے قصۂ پارینہ ہیں ان کا دور ختم ہو چکا ہے۔ نہ طرح
میں شعر کہنے والے بچے، نہ کہنے والوں کو ان کی صحیح کاوش کی داد دینے
والے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اگر مشاعرہ کے لئے کوئی مصرع طرح دے
دیجیے" تو اکثر شعراء "خود طرح دے جاتے ہیں۔" مگر غیر طرح میں سنانے
کی فرمائش کیجئے تو "بے طرح" سناتے ہیں۔

مشاعروں میں اب شاعرات بھی بلائی جاتی ہیں اور کافی مقبول
ہوتی ہیں۔ اگر مشاعرہ ٹکٹ کے ذریعہ ہو تو کافی ٹکٹ ان کے نام پر بک
جاتے ہیں۔ مگر جب کوئی شاعرہ غزل پڑھتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے
گویا غزل خود غزل پڑھ رہی ہو۔ ان شاعرات میں سے کچھ تو اپنی شکل
وصورت کی جاذبیت کے سبب مدعو کی جاتی ہیں اور کچھ اپنی خوش الحانی
اور نغمہ سرائی کے باعث۔ اگر ان کی مقبولیت کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور
نہیں جب ان کی تعداد مردوں کی تعداد سے بڑھ جائے گی اور وہ لوگ جو
تفریحِ طبع کے لئے کبھی ادھر جاتے ہیں وہاں جانے کی زحمت نہ گوارہ کرکے
اور رسوائی اور بدنامی کا خطرہ مول لئے بغیر محفلِ مشاعرہ میں شرکت کیا

کریں گے اور خوش ہوں گے کہ چلو ؏

"رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"

مشاعروں کی بدولت آج ہمارے درمیان ایک نئی قوم پیدا ہوگئی ہے جسے اناؤنسر کہتے ہیں۔ یہ حضرات اپنی حاضر جوابی، جملہ بازی اور ڈرامائی انداز گفتار کے باعث مشاعرے کا ایک جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اب کوئی بھی بڑا مشاعرہ ایک اچھے اناؤنسر کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا۔ شعرائے کرام کے اسمائے گرامی کے ساتھ ساتھ اب اناؤنسر صاحب کے نام نامی کا بھی باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے۔ اور اشتہار میں ان کا نام صدر مکرم کے نام سے بھی زیادہ جلی حروف میں شائع ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اب اناؤنسر اہمیت اور حیثیت میں صدر محفل سے بھی زیادہ ہے۔ وہ فرائض جو کبھی صدر کے ذمہ تھے اب اسی کو انجام دینے پڑتے ہیں۔ صدر صاحب مسند نشین ہوتے ہیں اور کچھ دیر جلوہ فرمائی کے بعد کوئی عذر رنگ پیش کر کے محفل سے چلے جاتے ہیں۔ غریب اناؤنسر کو شروع سے لے کر اختتام مشاعرہ تک اسٹیج پر نہ صرف موجود رہنا پڑتا ہے بلکہ ہر ممکن کوشش کے ذریعہ سامعین کو خوش کرنا اور مشاعرہ کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانا پڑتا ہے۔ مشاعرہ کی کامیابی اب بہت حد تک اناؤنسر کی نظامت پر بھی منحصر ہے۔ شاعروں کی کامیابی کا دار و مدار بھی کچھ حد تک اناؤنسر کی مہربانی پر ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے تعارفی اور تفریحی جملوں سے کسی کمتر شاعر کو یوں پیش کرتا ہے کہ سامعین اس کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں اور شاعر موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کلام کی داد پا جاتا ہے۔ اس کے لئے زمین ہموار کی جاتی ہے

لہذا اسے کلام سنانے کے لئے اس وقت بلایا جاتا ہے جب محفل شباب پر ہوتی ہے اور لوگ واقعی سننے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک اچھے شاعر کو کبھی کبھی اس وقت زحمت سخن دی جاتی ہے جب سامعین ہوٹ کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں اور مشاعرہ گاہ شاعروں کے لئے مقتل کا سماں پیش کرتی ہے۔ بجا ہے کہ بہت سے ہوشیار شاعروں نے ناظم سے دوستی کر رکھی ہے اور ان کو جا بے جا خوشامد میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ مشاعرے میں اچھا سلوک کیا جائے۔ مشاعرہ میں ناظم کی علت اس طرح رواج پا چکی ہے کہ اب اس کا ختم ہونا محال نظر آتا ہے۔

مشاعروں میں زیادہ کامیاب ہونے والے شعراء کی ایک خاص قسم ہوتی ہے جنہیں مشاعروں کا شاعر یا مشاعرہ مار شاعر کہتے ہیں۔ ان کے پرستاروں کا حلقہ بڑا وسیع ہوتا ہے اور تقریباً ہر مشاعرے میں پھیر پھیر کر یہی لوگ بلائے جاتے ہیں۔ آپ کیا ہی اچھا کلام کیوں نہ پیش کریں اگر ترنم کے ماہر اور خوش گلوئی دلحن داؤدی کے مالک نہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے ہوٹ ہونے کے پورے پورے امکانات موجود ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ مندرجہ بالا دونوں فن سے بخوبی واقف ہیں تو مبتذل سے مبتذل کلام سنانے پر کامیابی آپ کا قدم چومے گی۔ اور آپ سامعین مشاعرہ کی ٹکسالی زبان میں "مشاعرہ لوٹ لیں گے"۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ مشاعرہ میں کامیابی و سرخروئی حاصل کرنے کے لئے غزل کہنے سے زیادہ "غزل گانا" ہونا ضروری ہے۔

مشاعروں میں ہوٹنگ کی بلا ایک اہمیت رکھتی ہے۔ ہوٹنگ کیا

بوریت اور اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے "ہوٹنگ" ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شاعر بے موقع اور بے مزہ کلام سناتا ہے اور کوئی "سُنے نہ سُنے ہم سنائے جائیں گے" کے فارمولا پر عمل پیرا ہوتا ہے تو ہوٹنگ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ہوٹنگ کے ذریعہ ہی اس کو "مائیک" چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہوٹنگ بذات خود ایک مستقل فن ہے۔ اس کے بھی کئی انداز ہوتے ہیں۔ کبھی تالی بجا کر۔ کبھی واد کا شور یوں بلند کر کے کہ داد "بیداد" بن جائے۔ کبھی "مقطع پڑھئے" کا نعرہ بلند کر کے، کبھی کسی مصرع کی پیروڈی کر کے۔ غرضیکہ کئی طرح سے ہوٹنگ کی جاتی ہے۔ ایک بزرگ ناقد جو اتفاق سے شاعر بھی ہیں ایک مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ سامعین ان کی غزل نہیں سننا چاہتے تھے۔ چنانچہ کئی آوازیں ایک ساتھ اٹھیں۔ "حضرت آپ غزل نہ پڑھئے، آپ پڑھئے تنقید کیا ہے۔؟" ناقد شاعر پر جو گذری وہ ان کا دل جانتا ہے۔ ایک اور شاعر ایک مشاعرہ میں بڑی ہی سنجیدہ غزل سنا رہے تھے، قافیہ تھا جام، شام، نام وغیرہ۔ سامعین کو ہوٹ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اتفاق سے ان کی غزل میں ایک شعر کا قافیہ "اسلام" بھی تھا۔ موصوف جب اس شعر پر پہونچے تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ زبردست نعرہ بلند ہوا۔ "اسلام زندہ باد، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" شاعر غریب کا جو حال ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔

مشاعرے کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری

زبان کی ترویج و اشاعت میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اردو کو جو پذیرائی حاصل ہے وہ مشاعروں کی بدولت ہی تو ہے۔ وہ حضرات جو اردو سے نابلد ہیں وہ اچھے بُرے شعر کی تمیز تو چھوڑ دیجئے، موزوں اور ناموزوں کی بھی نہیں رکھتے۔ مشاعروں میں بڑے شوق سے جاتے ہیں۔ صف اول میں بیٹھتے ہیں اور واہ واہ کا شور بلند کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب مشاعرے صرف اردو کے اہم مرکز دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، رام پور اور عظیم آباد شہروں میں منعقد ہوتے تھے مگر قربان جائیے کہ مشاعروں کے کہ اب اردو ہر جگہ مقبول ہے اور مشاعرے مدراس آسام، بنگال، بہار اشٹر اور گجرات جیسے غیر اردو علاقوں میں بھی منعقد ہوتے ہیں اور بڑی ہی شان و شوکت کے ساتھ ع

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانے میں"

یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ اردو غریب کو جو ہر علاقہ میں مقبول ہے اور بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ابھی تک اپنا کوئی علاقہ نہیں حاصل ہے ــــ وہ جو ہر جگہ ہے اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ع

"یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم"

اس ترقی کے زمانے میں جب بیروزگاری کا مسئلہ بہت پریشان کن ہے اور جب بہت سے تعلیم یافتہ حضرات بڑی بڑی ڈگریوں کے باوجود مستقل بے کار ہیں اور چھوٹی سی چھوٹی ملازمت کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ مشاعرہ ایک "نعمت عظمیٰ" ہے۔ تھوڑی

سی اردو پڑھ لیجئے۔ پھر فن موسیقی اور آداب موسیقی سیکھ لیجئے۔ پھر
دیکھئے بیکاری کا مسئلہ کس آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ شعر کہنے اور سمجھنے
کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کو مطلع سے مقطع تک مرصع غزل ریڈی میڈ
مل جائے گی۔ ہمارے وہ اساتذہ جن کی شاعری میں اب پوچھ نہیں ہے
اور جن کا کوئی خاص ذریعہ معاش بھی نہیں ان کے بہت سے شاگرد ایسے
ہیں جو اپنے استاذ محترم کے ہاں مطالعہ و مشاہدہ اور شعر گوئی کی فطری
صلاحیت کی جگہ "کثیر زر اور سادہ کاغذ" لے کر جاتے ہیں اور بامراد
لوٹتے ہیں۔ وہ حضرات جو امپلائمنٹ ایکسچینج میں اپنا نام درج کراتے
ہیں اور کبھی عشق کے نامہ و پیام کی طرح کسی انٹرویو کارڈ کا بے چینی سے
انتظار کرتے ہیں، انھیں میرا مشورہ ہے کہ مشاعرہ کی اہمیت کو سمجھیں
اور اس سے اپنے "دردِ سر" اور "خواب پریشاں" کا علاج طلب کریں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مشاعرہ اب مالی منفعت
کا بھی اچھا ذریعہ ہے۔ بڑے بڑے شاعر ڈونیشن کے علاوہ ٹکٹ
اور پاس داخلہ کا سہارا لیتے ہیں اور بانیان مشاعرہ ان کے ذریعہ اچھی خاصی
رقم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مقامی اداروں کو ملتا ہے جن کی امداد
کے نام پر مشاعرہ منعقد ہوتا ہے اور بقیہ بڑا حصہ منتظمین، بالخصوص
سکریٹری اور کنوینر مشاعرہ کا "حق محنت" ہوتا ہے۔

مشاعرہ کے فوائد تو بے شمار ہیں، کہاں تک ذکر کیا جائے۔
میرے خیال میں اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ میل
ملاپ اور دوستی کی فضا بہ آسانی قائم کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اتحاد سے

سیاسی کارہنما اپنی "حکمت عملی" سے نہیں انجام دے سکتے ۔ اے شعراء حضرات مشاعرہ کے ذریعہ بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں [illegible]

[illegible] سے

بگڑا ہوا ماحول بنا سکتے ہیں
سینوں سے کدورت کو مٹا سکتے ہیں

جو آگ لگاتے ہیں سیاست والے
شاعر اسے نغموں سے بجھا سکتے ہیں

ہندوستان اور پاکستان میں "تجدید محبت" کے لئے اس "تیر بہدف" نسخہ کو آزمانا چاہئے ۔ میرے خیال میں ہندو پاک کے منتخب شعراء کی ایک کانفرنس "شملہ کانفرنس" سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی ۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے سیاست داں افلاطون کے شاگرد ہیں جسے شعراء سے اللہ واسطے کا بیر ہے ۔ یہ حضرات دو پڑوسی ملکوں میں دوستی قائم کرانے کا سہرا شعراء کے سر کیسے دیکھ سکتے ہیں ۔ بہر حال ۔ مجھے اپنی بات کہنے کا حق تو ضرور حاصل ہے سہ

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

مشاعرہ کے سلسلہ میں کہنے کے لئے ابھی باتیں تو بہت سی تھیں مگر چونکہ مجھے خود بھی آج ہی ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے رخت سفر باندھنا ہے ___ اس لئے مشاعرہ کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں ۔

اللہ رے یہ فصل بہار مشاعرہ
دیکھو جسے اسے ہے خمار مشاعرہ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانے میں
ہر انجمن ہے آج شکار مشاعرہ

معمور اس کے جلووں سے ہر بزم شوق ہے
ہر شہر اب ہے شہر نگار مشاعرہ

گلشن کی قید ہے نہ بیاباں کی قید ہے
ہر اک دیار اب ہے دیار مشاعرہ

جاڑا ہو یا کہ گرمی ہو یا فصل برشگال
ہر فصل اب ہے فصل بہار مشاعرہ

جائیں تو اس سے بچ کے کہاں جائیں دوستو!
قائم ہر اک طرف ہے حصار مشاعرہ

ہر دن ہزاروں محفلیں ہوتی ہیں منعقد
ممکن کہاں کہ کیجئے شمار مشاعرہ

جو اُردو دشمنی میں بہت پیش پیش ہیں
وہ بھی ہیں جان و دل سے نثار مشاعرہ

کیوں طنز کر رہے ہیں جناب حفیظ آپ
خود آپ بھی ہیں جبکہ شکار مشاعرہ



سکندر علی وجد

دل کشی رنگ پیرہن کی ہے — گل میں خوشبو ترے بدن کی ہے

بات اک یار کم سخن کی ہے — جو حکایت لب و دہن کی ہے

میرے افکار کے شبستاں میں — روشنی تیری انجمن کی ہے

کج کلاہوں کی سادگی پہ نہ جا — اک ادا یہ بھی بانکپن کی ہے

ہوش میں آ رہا ہے دیوانہ ! — کیا مہک زلف پُر شکن کی ہے

حسن عاشق مزاج زندہ باد ! — کس کو اب فکر جان و تن کی ہے

تیری غم آشنا نگاہوں میں — سرخوشی بادۂ کہن کی ہے

آج اردو کی آبرو ہے غزل — یہ نوازش مرے وطن کی ہے

وجد لطف حریم ناز نہ پوچھ
دل کشا کیفیت چمن کی ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سنیں
ایک سے ایک ابوجہل ہے کس کس سے لڑیں

اور تو کوئی بتاتا نہیں اس شہر کا حال
اشتہارات ہی دیوار کے پڑھ کر دیکھیں

یاں تو سب لوگ ہیں دستارِ فضیلت باندھے
کوئی ہم سا ہو جو محفل میں تو ہم بھی بیٹھیں

جتنے ساتھی تھے وہ اس بھیڑ میں سب کھو سے گئے
اب تو سب ایک سے لگتے ہیں کسے ہم ڈھونڈیں

گھر کی ویرانی طلب کرتی ہے دن بھر کا حساب
ہم کو یہ فکر ذرا شام کو باہر نکلیں

خواب دیکھے نہیں خوابوں کی تمنا کی ہے
رات کس طرح سے کاٹی ہے یہ کیا عرض کریں

حاصلِ عمر بس اک کیسۂ خالی کیوں ہے؟
اور کچھ بس نہ چلے زہر سے اس کو بھر لیں

ہم سے کیوں پوچھتے ہیں وقت کی رفتار کا حال
آپ کیوں خود ہی نہ مسند سے اتر کر دیکھیں

دل پہ اک بوجھ سا رکھا ہے یہ کس طور ہٹے
ورق سادہ میسر ہو تو کچھ ہم بھی لکھیں



علی عباس امید

ہر ایک سمت اندھیرا ہے کچھ کرو لوگو
تمہیں پکار رہا ہوں سنو سنو لوگو

سفید سایوں کے چہرے بھی بجھنے والے ہیں
آل عہد وفا کچھ نہ کچھ تو ہو لوگو!

اگر فضاؤں میں لکھنا ہو اپنا نام تمہیں
فصیل جسم کے آگے نکل چلو لوگو

بکھر چکی ہیں اندھیرے کی تیلیاں ہر سو
اب اور دیر مناسب نہیں اٹھو لوگو

کھڑے ہیں کتنے ہی عفریت اپنا منہ کھولے
کبھی تو روح کے اندر بھی دیکھ لو لوگو

حصار رنگ میں ہے عشق باز دیار ابھی
یہی تو وقت ہے تم تیشہ زن بنو لوگو

یقیں کا درد چمکنے لگا ہے چہروں پر
لگے نہ ٹھیس کہیں اعتبار کو لوگو

قدم قدم پہ سرابوں کی شمع روشن ہے
انھیں فسانوں میں اپنا کوئی چنو لوگو

تمہارے ساتھ ہی چلتی ہے ساعت امید
کبھی ٹھہر کے تم آواز بھی تو دو لوگو

ماہرؔ لکھنوی

دردِ دل سونپ کے انجان نظر آؤ گے!
یہ نہ سمجھے تھے کہ دو دن میں بدل جاؤ گے

تم بصد ناز کے دیکھ کے شرماؤ گے
ہم اگر اٹھ گئے اس بزم سے گھبراؤ گے

سلسلے حسرت و ارماں کے بکھرے ہیں لیکن
ان کھلونوں سے کہاں تک مجھے بہلاؤ گے

ترکِ الفت جو کریں ہم تو جئیں گے کیسے
تم تو ہنستی ہوئی محفل سے بہل جاؤ گے

ہاتھ اس خوف سے اٹھتے نہیں توبہ کیلئے
جام و مینا میں سما کر مجھے للچاؤ گے

غم جو مانگا ہے تو شکوہ نہ کرو صبر کرو !
اس نے ٹھکرا دیا تم کو تو کدھر جاؤ گے

مجھ سے دامن کو چھڑاتے ہو چھڑاؤ لیکن
کھوئے کھوئے ہوئے دن رات نظر آؤ گے

روز دہراتے ہو قصے مری بیتابی کے
میں جو کچھ یاد دلا دوں گا بگڑ جاؤ گے

ذرا مجھ کو رہِ ہستی سے گزر جانے دو
پاک دامانی کی اک اک سے قسم کھاؤ گے

ان کے الطاف مسلسل پہ نہ بھولو اتنا
اک نہ اک روز محبت کی سزا پاؤ گے

طالب جے پوری

وہی مہر تاباں وہی چاند تارے — شب و روز بدلے ہیں پھر کیوں ہمارے

نظر کے یہ شعلے، یہ دل کے شرارے — نہ بس کے تمہارے نہ بس کے ہمارے

کہاں ہم سے دیوانے اب ہیں جہاں میں — جنھیں پھول کی طرح کانٹے ہوں پیارے

جئے بھی تو کس آسرے پر جئے وہ — ہماری طرح زندگی جو گذارے

نبرد آزما کیا وہ طوفاں سے ہوگا — جو منجدھار ہی نا خدا کو پکارے

تمہیں کیا بتائیں جو حالت ہے اپنی — ہنسی سے بھی چھاتی پہ چلتے ہیں آرے

خبردار نیرنگ عالم سے طالب
یہ بہروپیا جانے کیا روپ دھارے

اختر حمیدی

ظلم کرتے ہیں برستے ہوئے بادل شب کو
شہر کے شہر کے جلتے ہیں جل تھل شب کو

ان کو فریاد کے اشکوں سے تعلق کیا ہے
کھول دیتے ہیں جو دروازۂ مقفل شب کو

چاند کی آگ میں کیوں جسم جلانے آئی
کون سمجھائے بھلا جا کے یہ پاگل شب کو

ریت کے رنگ میں ڈوبا جو خلا کا باسی
سنگ آواز کے جاتا ہے بیکل شب کو

دل تو کانٹوں کے سمندر میں اتر جاتا ہے
اپنی قسمت میں کہاں پھول کا آنچل شب کو

ہائے یہ تیری جدائی میں ہوا کے تھپیڑے
اینٹ سے اینٹ بجاتے ہیں مسلسل شب کو

منجمد کیسے نہ ہو جائیں ستاروں کے قدم!
روک رکھا ہے مری آنکھ نے تشتلی شب کو

رونق دکنی سیمابی

بات پتھر کی چلی ہے تو چلے پتھر بھی
غم نہیں اس کا کہ شیشے کے ادھر ہیں گھر بھی

شدّتِ پاسِ ادب ہے کہ عبادت کیا ہے
آنکھ جھکتی ہے تو جھک جاتا ہے خود ہی سر بھی

خونِ دل ہی سے نہیں پاتی ہے ضو شمعِ حیات
دشت آسنے پہ لہو دیتا ہے چشمِ تر بھی

سنگ ریزوں کو بھی زعمِ صنم آرائی ہے
رہ گیا نقطۂ موہوم فنِ آذر بھی

دل کا آئینہ ہے شفّاف و مجلّیٰ لیکن
کس نے دیکھا ہے مگر اس کے کبھی اندر بھی

موت لافانی، حیات اس کی حیات جاوید
آہ جس کو نہ میسر ہو سکوں مر کر بھی

ان کے کوچے سے جو لوٹے تو نہ تھے ہوش و حواس
اب یہ عالم ہے کہ ملتا نہیں اپنا گھر بھی

چاہیئے کچھ تو زمانے میں پنپنے کا شعور
زندگی جنت عشرت بھی ہے اور دو بھر بھی

تجزیہ تلخ حقائق کا ہو رونق کیونکر
وقت افسانہ سہی اس میں ہیں خیر و شر بھی



مہدی پرتاپگڑھی

یوں اندھے دھند پڑے عقلِ بشر پر پتھر
آج کشکولِ تغزل میں ہیں کنکر پتھر

وہ تو دیوانہ تھا کیا جانے گل و سنگ کا فرق
آپ چڑھ دوڑے تھے کیوں ہاتھ میں لے کر پتھر

جس گھڑی قدرتِ صانع کا ہوا تھا ادراک
ہو گیا دیکھ کے اس شوخ کو آذر پتھر

اب ابھرنے سے رہی اس پہ کوئی اور لکیر
ہے ترے دل کی طرح میرا مقدر پتھر

اک ترے لمس نے بخشا ہے اسے کیف و سرور
ورنہ پانی تھی یہ مے اور یہ ساغر پتھر

آذری نے مری بخشا اسے تہذیبِ خلوص
ورنہ دل ہی نہیں تھا آپ کا پیکر پتھر

آپ ہی کہئے اسے کس طرح فرزانہ کہیں
پھینکتا پھرتا ہے جو شخص کہ گھر گھر پتھر

میرے سجدوں سے ملی ہے اسے عظمت ورنہ
یہ حقیقت ہے کہ کل تک تھا ترا در پتھر

اک ذرا غور سے دیکھو تو کھلے گا جوہر
چشمِ بینا نہ ہو مہدی تو ہے گوہر پتھر

عطاءالحق قاسمی

پیدل ہے کوئی اور کوئی موٹر لیے ہوئے
ہر شخص اپنے ساتھ مقدر لیے ہوئے

کشکول لے کے جاتی ہے ہر نوجواں کے پاس
اک نازنیں میلی سی چادر لیے ہوئے

محفل سے تشنہ کام ہی رخصت نہ ہوں کہیں
ہم خواہشوں کا دل میں سمندر لیے ہوئے

گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا بستر سے آج وہ
آنکھوں میں شب کے خواب کا منظر لیے ہوئے

یہ شہر کیسا شہر ہے، کیسے ہیں اس کے لوگ
ہر کوئی آستیں میں ہے خنجر لیے ہوئے

سب دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں بولتے نہیں
کاندھوں پہ مصلحت کی ہیں چادر لیے ہوئے

حیران ہوں کہ ہر کوئی شیشے کے شہر میں
پھرتا ہے اپنے ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے

احتشام اختر

مجھے حیات کے سانچوں میں ڈھالنے والے
کہاں گئے وہ سمندر کھنگالنے والے

لڑھک رہا ہوں ڈھلانوں سے پیار کی میں تو
نہ آئیں راہ میں مجھ کو سنبھالنے والے

ہمارے شوق فراواں نے ڈس لیا ہم کو
کہ آستیں میں تھے ہم سانپ پالنے والے

ہوا میں پھینک نہ مجھ کو سمجھ کے کھیل کوئی
کبھی تو تیرے لگوں گا اچھالنے والے

یہ گھر ہے چھوٹا سا لیکن اماں ملے گی یہیں
کہ قتل ہوں گے سبھی سر نکالنے والے

کنواں ہوس کا تھا گہرا کچھ اس قدر اختر
کہ خود ہی گر گئے مجھ کو نکالنے والے

لطفی قریشی

ہم جہاں پھرتے ہیں گنبد کی صدا کی صورت
دیکھ آکر کبھی اس دشت بلا کی صورت

شیشۂ جسم بھی خوں رنگ نہ ہو جائے کہیں
موسم گل میں ہے خوں رنگ فضا کی صورت

ڈسنے ماحول کے ہاتھوں نہیں ہے خنجر پھر بھی
ہاتھ رکھتا ہے کوئی دست صبا کی صورت

کرب احساس کا جلتا ہوا لمحہ اکثر!
دل کے کہساروں میں گونجے ہے صدا کی صورت

تم وہ پیکر کہ ہو رعنائی تخلیق جمال
میں وہ تخلیق دریدہ ہوں قبا کی صورت

بے گھروں کی طرح بھٹکے ہے دیار شب میں
نظر آنکھوں میں لیے صبح ضیا کی صورت

اختر انصاری اکبرآبادی

عروجِ عشق دکھاؤ ذرا حسینوں کو
مہ و نجوم سے اونچا کرو جبینوں کو

جنونِ عشق میں احساسِ کمتری کیسا
بہاؤ چشمِ ندامت سے آستینوں کو

غرور کا ہکشاں دیکھتے ہو دیوانو
شعور ہے تو درخشاں کرو جبینوں کو

بڑھیں نہ خرمنِ ہستی کی سمت ظلم کے ہاتھ
دکھاؤ برق کے انداز خوشہ چینوں کو

صنم ہوس کے چھپائے ہوئے ہیں وہ دل میں
جو دیکھتے ہیں زمانے کی آستینوں کو

خلوصِ ذوقِ عمل کو نہیں غمِ تنقید
جو رو رہے ہیں تو رونے دو نکتہ چینوں کو

جبینِ گردشِ دوراں پہ ہے شکن باقی
پلاؤ اور ابھی میکدہ نشینوں کو

زمانہ نام نہ دورِ ہوس میں کیوں بیٹھے
سجاؤ عشق سے لمحات کی جبینوں کو

ہمارے نام کا سکہ ہے بزم میں اختر
فروغ ہم نے دیا ہے نئے قرینوں کو

فوزیہ جاوید

ناشگفتہ کلیو میں شوق ہے تبسم کا
بار سہ نہیں سکتیں دیر تک "تلاطم" کا

جانے کتنی فریادیں ڈھل رہی ہیں نغموں میں
چھیڑ رہی ہے دکھ کی بات نام ہے ترنم

کتنے بیکراں دریا پار کر لیئے ہم نے
موج موج میں جن کی زور تھا تلاطم کا

اے خیال کی کلیو! اور مسکرا لیتیں
کچھ ابھی تو آیا تھا رنگ سا تبسم کا

گفتگو کسی کی ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

حسرتِ محبت سے دیکھتے رہو جاوید
ہاتھ آ نہیں سکتا حسن ماہ و انجم کا

اُتر پردیش میں اردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اردو جسے دستور ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل، ہمارے ملک خاص طور سے ہماری ریاست اتر پردیش کی ایک اہم اور مقبول عام زبان ہے یہ کسی ایک فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصے دار ہیں۔ اتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اس کے پھلنے پھولنے اور اس کی ترقی و توسیع کے لیے متعدد اہم اور دور رس اقدامات کئے ہیں۔

پرائمری سطح پر :-

- جولائی سنہ ۱۹۷۲ء سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اردو پڑھنے کی سہولت۔
- اس مقصد سے نئے تقریباً ۴ ہزار اردو ٹیچروں کا فیصلہ۔
- اگر کسی پرائمری اسکول میں اُردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اس اسکول میں کم سے کم ایک اردو ٹیچر کا انتظام ہوگا۔
- تمام تسلیم شدہ اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا منصوبہ

- ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کی استعداد رکھنے والے امیدواروں کو داخلہ میں سہولت۔
- اُردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر ان ٹرینڈ اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- کوئی ان ٹرینڈ اردو ٹیچر اوپر کے احکامات کے بغیر علاحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اُردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لئے تر غیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ۔
- نئے اُردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر:۔

- جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کے لئے ایک اُردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔
- جونیر ہائی اسکول تک تمام کتابیں اردو میں دستیاب۔

ڈپٹی ڈائریکٹر (اُردو)

- اُردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی

ڈائریکٹر (اُردو) کی تقرری۔

ڈگری سطح پر :-

● اعلیٰ سطح پر بھی اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

● بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، پیلی بھیت، مرادآباد، بریلی رامپور وغیرہ کے ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اُردو پڑھانے کے لئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔

● یونیورسٹیوں کے علاوہ اُن سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اُردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کے لئے کارروائی۔

● تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اُردو اکاڈمی

● اُردو زبان کے تحفظ اور اردو ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اُتر پردیش میں اُردو اکاڈمی کا قیام۔

● اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل ر[illegible]

● اُردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو [illegible]

[illegible]ب سے اب تک پانچ لاکھ روپئے کے انعامات [illegible]

● تمام ضلع افسران [illegible]

- ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اردو کا امتحان پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اردو میں بھی اشاعت۔
- ہندی کی طرح اردو اخبارات کو بھی سہولتیں۔

اردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے
اسکی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمہ اطلاعات اتر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا۔

JT ٤٤٥ ج/۹۹۷۲/٧٤

یم
- جونیر ہائی ا
ڈپٹی ڈائریکٹر (اردو)

- اردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار ہو

uly 1973. Regd. N. . I

Registered with the registrar of Newspapers at R.N. 22...

SHAHKAR Urdu Literary Digest

17th Year of Publication VARANASI. Price Rs. 1-50